شاعر اور چٹان

(دس افسانے)

پرتھوی ناتھ شرما
ایم۔اے

ناشر:- پرتھوی ناتھ شرما
۱۳۴۹ پیپل مہادیو
دہلی

باراوّل
قیمت عہ

(مطبوعہ کورونیشن پرنٹنگ ورکس فتحپوری دہلی)

فہرست

تسنیم

نیلے آسمان، درختوں اور پرندوں کے نام
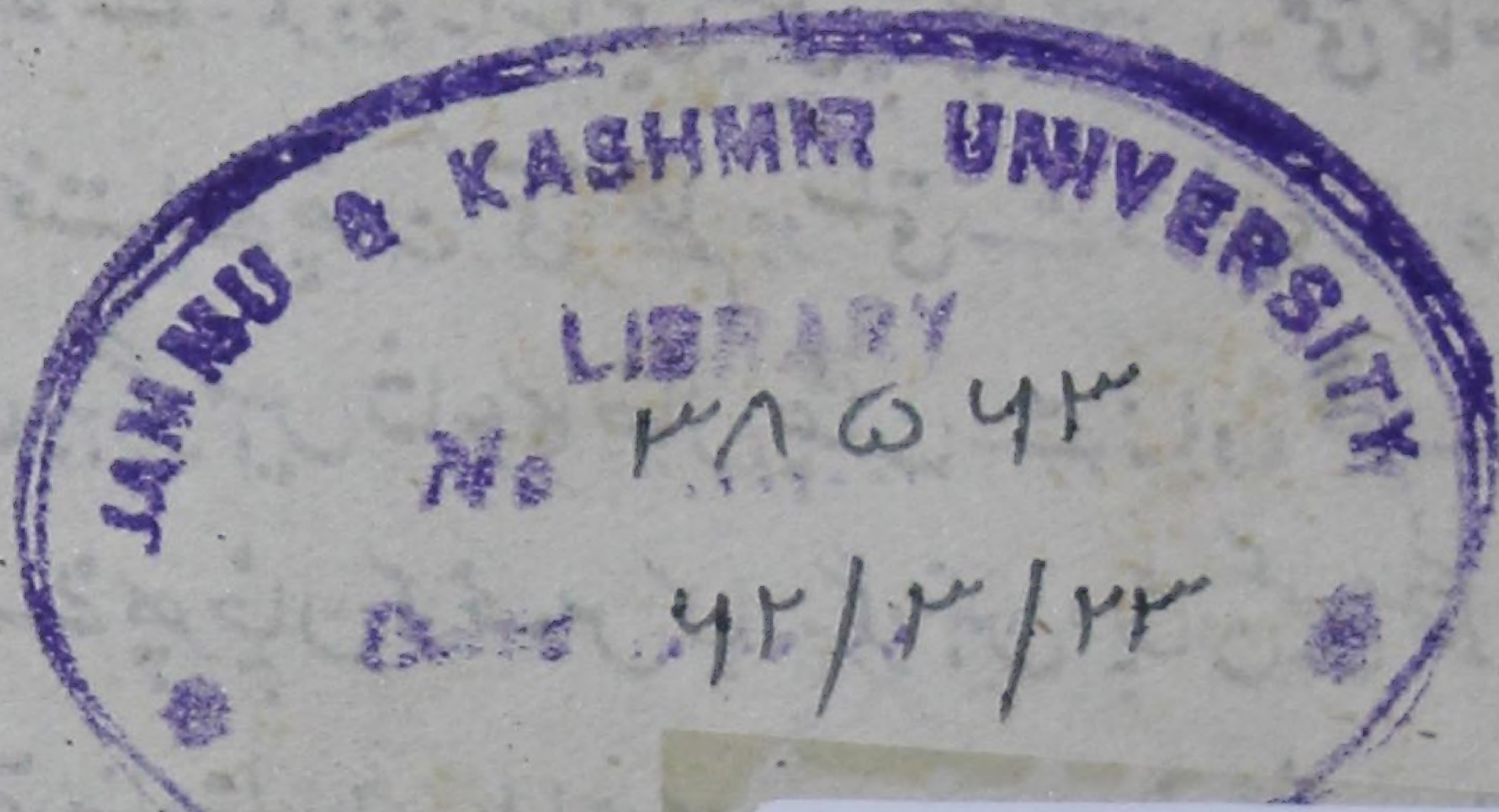
شاعر اور چٹان

کتنی مستحکم چٹان!

صدیوں کی بنیادوں پر کھڑی وہ چٹان ہر روز مستحکم سے مستحکم تر ہوتے جا رہی تھی۔ سنگ خارا والی چٹان، ونود نے ان پتھروں کو اپنے ہاتھوں سے مس کیا، کتنی سخت اور مضبوط چٹان، . . . . اتنی سخت کہ ہزاروں ٹن وزنی ہتھوڑے بھاپ اور بجلی کی مدد سے اُسے نہ توڑ سکیں۔ ونود کا خیال، شاعر مسکرا دیا، اس کے خیالات بھی اس چٹان کے مانند مستحکم بننا چاہتے ہیں۔ بننے کی کوشش کی ہے مگر . . . . ونود اُس چٹان کو محسوس کر رہا تھا، اتنی سخت چیز کا وہ خیال تک بھی

نہیں کر سکتا۔ کتنی سخت۔ اُس کے خیالات سختی کا اندازہ لگانے کی خاطر مختلف
شاہراہوں پر بکھر گئے۔ مگر وہ شاہراہیں بھی کی پڑ چکی تھیں۔ سختی کا خیال وفود کو تڑپانے
لگا۔ آخر کتنی سخت، وہ چٹان کتنی مستحکم ہو سکتی ہے۔ شاعر کے عزم سے زیادہ
مضبوط۔ ایں! ہرگز نہیں شاعر کا خیال چٹان سے زیادہ مستحکم ہے۔ نہایت ہی محکم
..... وفود نے پھر چٹان کو محسوس کیا۔ ہرگز نہیں، چٹان کبھی مستحکم نہیں ہوتی خیال
چٹان کو سخت تر بنا دیتا ہے۔ ہاہاہو ہو ...... وفود ہنس دیا۔ چٹان اس کے
خیال میں گھلتے گھلتے بکھر سی گئی، ریزہ ریزہ ...... ذرات، گرد، مٹی .....
ہرگز نہیں! شاعر کا عزم چٹان سے زیادہ سخت ہے۔ وفود کے خیالات نے اُسکی
پیشانی پر پسینہ کے موتیوں کو بیدار کر دیا۔

"اُف، وفود نے پیشانی سے پسینہ کی بوندوں کو پونچھا۔" اُف" کبھی کبھی
خیالات کبھی ہمیں ایسی ایسی غلط شاہراہوں میں بھٹکنے دیتے ہیں کہ ہماری ان دو
آنکھوں کے سامنے مایوسیوں کے سوتے پھوٹ اُٹھتے ہیں ان سوتوں کے
سامنے عقل انسانی سوائے بے بسی کے ہاتھ پیر مارنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی۔

چٹان کا خیال وفود کو خیر باد کہہ رہا تھا، خیالات نے اُسے کتنا مضمحل کر دیا تھا
اور وہ زندگی کے اس پُر آشوب زمانے میں کچھ سہارا ڈھونڈھنے اور تھکاوٹ رفع
کرنے کے خیال سے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی تکان اُتارنے کے خیال
سے پیشانی کو ہاتھ کی ہتھیلی پر سہارا اور گری ہوئی نگاہوں سے نیچے کی طرف
دیکھنے لگا۔ اُس ابدی خاک کی طرف جس میں صدیوں کے طوفان کی نشانیاں
ہیں جو بہر صورت قائم رہنے کی کوشش کرتی ہے خون کے دریا میں نہا نہا کر پھر سوچ

کی نکھری کرنوں اور نیلے آسمان کے احساس میں اپنی پرانی خصوصیتوں کو حاصل
کر لیتی ہے۔ ابدی خاک۔۔۔۔ ونود کی پیشانی پر سلوٹیں سی نمودار ہوئیں وہ بھی
تو اس میں پیدا ہوا ہے، اور اسی میں مل جانے کے لئے۔ اور ابدی خاک، وہ ہنستی
رہتی ہے، دنیا کی ہر ایک عجیب و غریب بات اُسے ہنسنے کے لئے مجبور کر دیتی ہے۔
وہ دو فقروں کے سوائے اور کچھ نہیں جانتی۔ "مجھ سے اٹھو" اور "مجھ میں ہی غائب
ہو جاؤ"۔ درست، درست، ابدی خاک۔۔۔۔ تجھ سے اُٹھیں، اور تجھ میں غائب
ہو جائیں۔ نہیں! شاعر کا خیال کہنے لگا۔ ہرگز نہیں۔ آخر کیوں؟ ابدی خاک سے
اُٹھ کر پھر ابدی خاک میں مل جانا، عجیب حماقت ہے، جسم۔ ونود پھر مسکرایا، صرف جسم
اور شاعر کی رُوح۔۔۔۔۔ وہ کبھی خاک میں نہیں مل سکتی۔ وہ تاروں بھری راتوں
میں آسمان پر گاتی پھرتی ہے، افق کا آنچل اُٹھا اٹھا کر اُس کے شرمیلے مگر خوبصورت
چہرے کی زیارت کرتی ہے۔ درختوں کی ٹہنیوں کے ساتھ ناچتی ہے، اور گم کردہ
راہ مسافر کی المناک نگاہوں میں جذب ہو کر اُس شاہراہ پر کھڑے ہو کر نسل آدم
کو تلقین کرتی رہتی ہے۔ محض چند لمحے، خوشی کے چند لمحے، اور اُن لمحوں میں ہم
المناک نگاہوں سے ہر کس و ناکس کے دل پر غم کی پرچھائیاں ڈالتے رہتے ہیں،
اصل زندگی خوشی کا خیال ہے، محض خیال۔۔۔،

"رانگا" کچھ سُریلی سی آواز۔ کوئی چٹان تلے گلدوئے کی بیلوں کو چھیڑتا چلا
جا رہا تھا۔ مٹی کے ساتھ اور۔۔۔۔ گلدوئے مُسکرا سی اُٹھی۔۔۔۔ "رانگا"
ونود اُس آواز میں گم ہو گیا۔ شاید یہ اُس کے کھوئے ہوئے زمانہ کی صدائے باز
گشت ہو۔ جو اُس کے کانوں میں بار بار گونج رہی تھی۔

"رانگا ٹھہرو"۔ ونود جھکا۔ چٹان تلے رانگا اور اس کا ساتھی۔ اس ساتھی کے چہرے پر گم شدہ خوشی کی پرچھائیاں، ایک عجیب قناعت کا نور جو برسات کے بعد نیلے آسمان کی طرح نکھرا ہوا تھا۔

"رانگا" دوشیزہ نے اپنے چمکیلے ہونٹوں کو بھینچتے رخساروں پر خون دوڑاتے ہوئے کہا..... "رانگا تو پنیچھ سے میرے لئے کوئی چیز نہیں لایا۔ یہ بات ٹھیک نہیں رانگا"۔ ونود چٹان کے پتھر کی آڑ میں یہ سب باتیں سننے لگا۔

"کیا چیز۔ صرف بانسری کے لئے پیسے پاس تھے۔ لے آیا، دیکھو اور جب میں اسے بجاتا ہوں تو تو...... رانگا مسکرایا۔ اس نے بانسری کو منہ سے لگایا۔ "سن نینا، سن"۔

دو مورتیاں اس چٹان تلے بیٹھ گئیں۔ رانگا نے بانسری بجانی شروع کر دی۔ بانسری کا پھندنا ہوا میں لہرا رہا تھا۔ رانگا کی نگاہ دور افق کی لکیروں میں کسی چیز کو کھوج رہی تھی، ان تاروں کو جو کبھی کبھی خود بجنے لگتے ہیں، اور جب ان پر انگلیاں پھیری جاتی ہیں تو وہ خاموش رہتے ہیں۔

"رانگا" نینا نے رانگا کی طرف دیکھا۔ رانگا تیری بانسری بہت اچھی ہے۔

"ہاں!" رانگا نے گردن ہلائی۔ "یہ کبھی کبھی دل کی بات کہہ دیتی ہے نینا، جب چشموں کا پانی سوکھ جاتا ہے، برسات کا موسم ختم ہو جاتا ہے، اور جب یہ دنیا بالکل خشک ہو جاتی ہے تو....."

"تو!"

"تو یہ بانسری ہی...... یہ بانسری ہی، نینا! ہمارے دل کو ٹھنڈک

پہنچاتی ہے"۔ رانگا پھر بانسری کے نغموں میں گم ہو گیا۔ وہ خشک دنیا میں موسیقی سے دریا بہا دینا چاہتا تھا۔ دنیا بالکل خشک ہے۔ سب دریا کے پانیوں کو پوجتے ہیں، سوتوں کو نہیں پوجتا۔ آخر پوجنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ غم کے سوتوں سے جو دریا ابلتا ہے وہ مدت دراز تک بہت سی غمگین روحوں کو خوشی کے پانیوں سے سرسبز و شاداب بنا تا رہتا ہے، اور سر چشمہ، اس کی زندگی میں سوائے رونے کے کیا رکھا ہے؟ محض رونا ہی رونا، زندگی کی صبح سے موت کی شام تک . . . . مایوسیاں، المناک لمحے، گھٹی گھٹی تاریکیاں . . . .

"رانگا" نینا نے اپنے سرخ ہونٹوں کو بانسری سے چپکا دیا۔ "رانگا مجھے بانسری بہت پیاری لگتی ہے۔ یہ میرے دل کی آواز کو باہر کھینچ لیتی ہو۔ رانگا، میں! میں! بکری اور اس کے بچے، نرم ملائم ملائم کھال، نینا آگے بڑھی اس نے ایک بکری کے بچے کو گود میں اٹھایا، اور پچکارنے لگی، بکری مبہوت رانگا کی بانسری کو سن رہی تھی۔ رانگا ازلی نغمہ چھیڑ رہا تھا، مستی کے راگ، وہ دریا پار سے نینا کو بھگا لایا تھا اس نے پینٹھ سے واپسی کے وقت چشمے پر کھڑے ہو کر بانسری کا راگ چھیڑ دیا تھا اور نینا نے اپنی جھونپڑی کے دروازے پر کھڑے کھڑے ان راگوں کو سنا۔ وہ بھاگی چلی آئی، لیکن دریا کا پانی، نینا کانپ اٹھی دریا کا پانی . . . . . رانگا کے چہرے پر کچھ کچھ صبر تھا، اس نے چپکے چپکے نینا سے کہا۔

"مجھے ایک پل معلوم ہے، وہاں دریا بہت کم گہرا ہے، اور ایک برگد کا بہت بڑا درخت ایک سرے سے دوسرے سرے تک، آندھی اور طوفان سے گر کر پھیل گیا ہے، بس وہی ہمارا پل ہے"۔

اور وہ دونوں اُس پل کو پار کر بھاگم بھاگ یہاں تک آن پہنچے تھے۔ نینا نے رانگا سے تحفہ مانگا تھا، کہا تھا کہ پینٹھ میں سے کچھ تحفہ لانا۔ لیکن رانگا کی جیب میں صرف ایک بانسری خریدنے کے لئے پیسے تھے اور وہ بانسری لے آیا، صرف ایک ذریعہ۔ ۔ ۔ ۔ ایک آواز جس کے تار نینا کی روح کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں، اور نینا مصنوعی پل کو پار کر کے رانگا کے ساتھ چٹان تلے بھاگ آئی تھی۔

دوپہر ڈھل رہی تھی، آسمان کا رنگ پھیکا پڑتا جا رہا تھا، وادی کی آوازیں خاموش تھیں، چند ایک بکریاں اِدھر اُدھر گلوئے کے بیلوں کے پاس، یا گوگل کے سایہ میں جھاڑیاں چبا رہی تھیں، دُور گہرائی میں تلیٹی کے سہارے سہارے گائے بھینس چر رہی تھیں، اور چرواہے آرام کی تان سو رہے تھے، درختوں کی اُونچی اُونچی چوٹیوں پر شکرے اور باز شام کے وقت ننھی ننھی چڑیوں کا شکار کرنے کی تاک میں چاروں طرف نگاہ ڈال رہے تھے، وادی میں دھوپ اور سایوں کے سبب سے ایک چوسر سی بن گئی تھی، خشکی کے موسم کے سبب جھرنوں میں سے پانی مرمر کر بہہ رہا تھا۔ چشمے تقریباً خشک کے برابر تھے۔ رانگا اپنی بانسری کو منہ سے لگائے لگائے نینا کے زانوؤں پر سو رہا تھا۔ شاید وہ بانسری اب بھی خاموش راگ الاپ رہی تھی، نینا کے ہونٹوں پر قناعت جاگ رہی تھی، اُس کی کچھ کچھ نیلی آنکھوں میں آسمان کا سایہ نکھر رہا تھا، پاس ہی جھاڑیوں کو چبانے والی بکریاں تھوتھڑیاں اُوپر اُٹھا اُٹھا کر رانگا اور نینا کی طرف دیکھ رہی تھیں، پھر نینا کے لب کھلے اور وہ بڑبڑانے لگی۔

"تو تھک گیا ہے رانگا۔ لیکن شام سے پہلے۔"

"بھاگ چلو ننیا۔ چلو، گاؤں والے ہمارا پیچھا کر رہے ہیں۔ بھاگ چلو ننیا"
رانگا نیند میں بڑبڑا اٹھا، اس کی آنکھ ایک دم کھل گئی۔ اس کے چہرے پر مایوسی
کے آثار نمایاں ہو گئے۔

"کوئی نہیں رانگا۔ کچھ نہیں۔" ننیا نے رانگا کی پیشانی سے پسینے کی بوندیں
کو پونچھا۔ اس ذہنی کشمکش کے چند لمحوں میں جب رانگا کا خواب بھی خیالات
سے بھرپور تھا، رانگا گھبرا سا گیا۔ وہ ننیا کو گاؤں سے دور بھگا لایا تھا۔ ایک
نئی دنیا بسانے۔ . . . برگد اور بڑ کے سایوں تلے۔ . . . جب اس نے
دریا کو پار کیا تھا تو وہ بہت خوش تھا، اُس نے ننیا سے کہا تھا "بس اب ہم تم
دور کسی گاؤں میں جا کر دم لیں گے تو اور میں۔"

"ہوں۔" ننیا مسکرا دی تھی۔

"میں اپنے ہاتھ پاؤں سے کام کروں گا۔ مزدوری . . . اور پھر ہم دونوں
اپنا گھر بسا لیں گے"۔ لیکن مجرم کا خیال رانگا کو خواب میں بھی پریشان کر رہا تھا۔
اُسے گاؤں کے آدمی سر پر لٹھ رکھے ہلہ بولتے دکھائی دے رہے تھے۔ مارو، پکڑو،
بھاگیو۔ اور جب وہ ہڑبڑا کر اُٹھا تو اُسے وہ خیال پھر ستانے لگا۔ بانسری الگ
پڑی تھی۔ ننیا کے اُودے ہونٹوں پر مایوسی جھلک اُٹھی۔

"اب" ننیا نے رانگا کی آنکھوں میں آنکھ ڈالتے ہوئے کہا "اب!"

"اب" رانگا نے ننیا کے بالوں میں اپنے مرجھائے ہوئے ہاتھوں کو
پھیرا "اب" رانگا کپڑے جھاڑتا اُٹھا۔

"تو چلو آگے - چھ میل پرے گاؤں گاؤں ہے اس میں بسیرا مل جائے تو اچھا ہے، کوئی پوچھے گا کہ میرے ساتھ کون ہے - تو کہہ دوں گا میری بیوی ...... " رانگا نے نینا کے شہابی رخساروں پر اپنی انگلی کو نچایا - میری بیوی ..... " دوپہر ڈھل رہی تھی، شفق کا رنگ نینا کے رخساروں پر سرخی بکھیر رہا تھا "اور" رانگا نے قدرے توقف کے بعد کہا" رات کے وقت سب حفاظت ہو جاتی ہے - بھلا رات کو کون ہمیں دیکھ سکتا ہے"۔

احساس - اطمینان - اور وہ بھی قطعی غلط ...... ونود نامعلوم کتنی دیر سے وہاں چٹان کی آڑ میں بیٹھا بیٹھا رانگا اور نینا کی باتیں سن رہا تھا - رانگا کے دلاسہ دینے والی باتوں کو سنکر ہنس دیا - ایک دم زبردست قہقہہ ..... ہاہاہا ہوہو ...... وہ پھرتی سے چٹان سے اترا رانگا اور نینا گھبرائے سے بھاگنے کی تیاریوں میں بھوچکے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے -

" ٹھہرو " ونود نے نہایت ملائم انداز میں ان دونوں کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا -

"حضور" رانگا نے التماس بھرے الفاظ میں کہا "حضور یہ میرے ساتھ زبردستی بھاگ آئی ہے - حضور میں پرماتما کی قسم کھا کے کہتا ہوں - سرکار ..."

" رانگا " نینا کے ہونٹ تھر تھر کانپ رہے تھے - مجرم کتنا کمزور دل انسان ہوتا ہے - نینا کے چہرے پر خجالت کی سرخی دوڑ رہی تھی، اور اس کے جسم کا نچلا حصہ اُس مچھلی کے مانند لرز رہا تھا جو ابھی پانی سے نکال کر زمین پر ڈالدی گئی ہو -

"حضور" رانگا نے پھر دہرایا: "حضور" اور رانگا نے ونود کے پاؤں پکڑ لئے۔

"حضور کے بچے...... الگ کھڑا ہو جا" ونود ایک نئے ڈرامہ کا ایکٹر بننا چاہتا تھا۔ "اچھا صاحب ذرا چپ چاپ ادھر بیٹھ جائیے۔ پہلے لڑکی کو بھگا کر لایا اور اب اس سے منکر ہوتا ہے۔ ایں!"

جرم ایک کمزور انسان کے سامنے کانپ رہا تھا۔ رانگا کے ہاتھ کانپنے لگے۔ وہ اب کیا کرے۔ وہ ایک دم نڈھال سا ہو گیا۔ اس کی لاٹھی ہاتھ سے چھوٹ کر دور گڈھے میں جا گری تھی۔ اور ایک ننھا مجرم بہت ہی کمزور انسان بن جاتا ہے۔

"اور تو" ونود لڑکی کی طرف مخاطب ہوا۔ "تو اپنی مرضی سے اس کے ساتھ آئی ہے"

"نہیں سرکار۔ نہیں۔ پرماتما کی قسم! سرکار! پرماتما کی قسم..." نینا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کا آنچل آنسوؤں میں بھیگ گیا، ایک غیر متناہی آنسوؤں کا سلسلہ...... اور ہر ایک آنسو نوحہ پڑھ رہا تھا: "سرکار یہ مجھے زبردستی بھگا لایا ہے۔ زبردستی......"

"سچ کہتی ہے" ونود نے ذرا اور اکڑ کر کہا۔

"سرکار۔ بالکل سچ" نینا کی آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی لڑیاں پرو رہے تھے۔ اس کو غم تھا اس بات کا کہ رانگا کی محبت کتنی ناپائیدار ہے، پانی پر لکھے ہوئے حرفوں کی مانند، قطعی غیر مستحکم.... اور اب اسے ایک ڈر اور ستا رہا تھا۔ مجرم کا خیال۔ مجرم کتنا کمزور ہوتا ہے، اسے ہر ایک اجنبی انسان انصاف کا

ناخدا نظر آتا ہے رانگا کے ہاتھ شل سے پڑ گئے تھے۔ ننیا کی نگاہ میں اس دریا کا پل گھوم گیا جس کو وہ گرے ہوئے بڑے کے درخت کے ذریعہ پار کر کے آئے تھے۔ جس وقت رانگا اُس کے زانو پر سر رکھ کر سویا تھا تو وہ رانگا کے کتنے قریب آ گئی تھی بالکل نزدیک، جتنی کہ پھول اور اس کی پتیاں ...... اور اُس نے نہ معلوم کون سے جذبہ کے زیر اثر رانگا کے بالوں کو چوم لیا تھا، اُس وقت اُس کا چہرہ کیسا بھیگ سا گیا تھا۔ شرم کے مارے۔ اس کی نگاہیں جھک سی گئی تھیں اور اُسے اس خلوت کی جگہ اُوپر کی طرف مُنہ اٹھانے تک میں شرم محسوس ہوتی تھی۔ اور اب ...... رانگا اور ننیا دونوں مجرموں کے مانند، ونود کا پیچھا کر رہے تھے۔ معصوم بچہ کی طرح ان کے چہروں پر خوف وہراس اور آنے والے واقعات کی پرچھائیاں ان کو حیران و پریشان کئے دیتی تھیں ان کی حالت اس وقت اُن چڑیوں کے مانند تھی جو باز کی شکل دیکھتے ہی گھبرا سی جاتی ہیں اور آس پاس کی کسی جھاڑی میں چُھپ نہیں سکتیں۔ وہ مضبوط ہاتھ، وہ مضبوط ہاتھ اُن کو پکڑ سکتے تھے اور ...... راہگیر ...... کوئی راہگیر نہ ہوگا جو اُن کو بھاگنے کی اجازت دیدے۔

"کدھر ہے تمہارا گاؤں؟"

"سرکار۔ سرکار ...."

"سرکار کے بچے۔ بتاؤ کدھر ہے تمہارا گاؤں ...." یہ تلیٹی میں کتنے ہی راہگیر اپنے کندھے پر لٹھ رکھے جا رہے تھے۔ رانگا اور ننیا ڈر کے مارے گھبرا رہے تھے۔ گاؤں والوں کا انصاف۔ اُف کتنا سنگین ہوتا ہے اگر اُن

لوگوں کو معلوم ہو گیا تو بلا تامل ان دونوں کی لاٹھیوں سے خبر لیں گے۔

"ادھر سرکار۔"

"اچھا چلو۔" پھر تھوڑے سے توقف کے بعد، ننیا کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے ونود نے کہا: "لڑکی تجھے اس سے محبت ہے۔ سچ بتانا۔ تو اس آدمی سے پیار کرتی ہے۔ کیوں؟"

"سرکار۔" ننیا کے رخساروں میں شرم جھلک اٹھی۔ ان کا رنگ برسات کے موسم میں پکے ہوئے آم کے مانند شباب آور بن چلا۔ اودے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی نمودار ہوئی۔ سر جھک سا گیا۔ دونوں ٹانگوں کی کڑیاں آپس میں ٹکرا سی گئیں۔ ان کی آواز ایک نغمہ میں گم ہو گئی۔ شاید وہ اس محبت کا اعتراف کر رہی تھی جس کا رانگا اور ننیا کی آنکھیں پتہ دیتی تھیں۔ "سرکار" کنول کی ڈنڈی پھر لچک سی گئی۔

ونود جھکا۔ ڈالی سے ایک جنگلی گلاب کا پھول توڑا، اور اپنے ہاتھ کی دونوں ہتھیلیوں کے درمیان مسلنے لگا۔ "اچھا تجھ کو اس سے محبت ہے۔ خوب۔۔۔ جنگلی پھول۔" تلیتی کے سہارے میدانی علاقہ میں جگہ جگہ گلابی پھول ہواؤں میں ایک ہلکی ہلکی خوشبو پھیلا رہے تھے۔ رانگا اور ننیا دو پتیل کی مورتیوں کے مانند ونود کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے۔ اندھیرا؟ اندھیرا تقریباً ہو سا چلا تھا۔ نئے چاند کی روشنی میں، ان دو پتیل کی مورتیوں میں چمک اور زیادہ بڑھ چلی تھی۔

ونود نے پھر قدرے توقف کے بعد ننیا سے کہا۔

"تو تجھ کو اس سے محبت ہے، ایں! ٹھیک۔۔۔ اور تو اس بات

کا اقرار کرتا ہے، تجھ کو اس لڑکی سے محبت ہے۔"

رانگا مسکرا یا اٹھا۔ بتیل کی مورتی نکھر رہی تھی۔ "ہاں! ہاں سرکار...."

"بہت خوب.... اور تم دونوں اتنے ڈرپوک ہو کہ جھوٹ بولنے سے دریغ نہیں کرتے۔ اچھا!...." شاعر کے سامنے ایک چٹان کھڑی تھی۔ نہایت مستحکم.... اور ایک کند پھاوڑہ.... وہ کس طرح اس چٹان کو توڑے ونود سوچنے لگا۔ ان دو گاؤں کی ڈرپوک ہستیوں کے درمیان عجیب قسم کی محبت ہے۔ وہ ڈر کے مارے اپنے گاؤں تو واپس جانے سے رہے۔ اور دوسرے گاؤں میں جانے ہچکچاتیں گے۔ بزدل.... کیا اس میں اتنی بہادری نہیں جو اس محبت کی کو پروان چڑھنے دے شاید گاؤں کے باغی شہر میں ایک نئی لہر پیدا کردیں.... محض ایک جذباتی چٹان.... بے عمل شاعر کا سپنا.... محبت سے آشنا نہیں۔ اور گاؤں میں محبت پھوٹتی ہے، مگر نہایت بھونڈے طریقہ سے پرورش پاتی ہے۔ رانگا اور رنیا نئے نکلے چاند کی روشنی میں نہایت خوبصورت نظر آتے ہیں۔ شاعر کی چٹان.... ونود نے سوچا کتنی نرم پڑ چلی ہے۔ اُس نے اپنی عمر کے لمبے سایوں میں جذبات کے پلوں کو پار کرکے رومان کے میدانوں میں ہنستے کھیلتے پھولوں کو ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے دیکھا تھا۔ شاعر۔ ایک تنہا ہستی ہے وہ ہر ایک جاندار کی روح میں پیوست ہو جانا چاہتا ہے اور اُس کا کند پھاوڑا اُس مستحکم چٹان کو توڑنے میں ہمیشہ کوشاں رہتا ہے جو ایک جذباتی اور خیالاتی سکوت کی دنیا کے قائم ہونے میں حارج ہے۔ رانگا اور رنیا ڈرپوک لیکن محبت کے پروانے.... ونود جذبات کے اتھاہ سمندر میں

ڈوب گیا۔ وہ ان دونوں رُوحوں کو ملانے کی کوشش کرے گا۔ اس آسمان تلے چاند کی پھیکی روشنی میں۔ اس کے دل میں ایک سمندر موجیں مار رہا تھا۔ جذبات کا سمندر۔ ۔ ۔

"رانگا تجھے نینا سے پیار ہے۔ سچ بتانا۔ ۔ ۔ ۔"

"ہاں!"

ونود کے ہاتھوں میں دو گلاب کے جنگلی پھول تھے جو اُس نے چلتے چلتے اُن پودوں کی ٹہنیوں سے جدا کر دئیے تھے جو اُس ٹیلے اور میدان میں پر ورش پا رہے تھے۔

"دو جنگلی پھول"۔ ونود نے دونوں گلاب کے جنگلی پھولوں کو یکجا کیا۔ "دو جنگلی پھول۔ ۔ ۔ ۔" تھوڑے توقف کے بعد۔ ۔ ۔ "رانگا اور نینا دیہات نے تم کو ڈرپوک بنا دیا ہے نا۔ ۔ ۔ ۔ ایں!"

پیتل کی مورتیاں ہنس دیں۔ پھیکے چاند کی روشنی میں کچھ آوازیں گونج گئیں۔ ونود چونکا۔ پیتل کی مورتیوں پر اُداسی چھا گئی۔ بہت سے آدمی ایک دم بھاگے آرہے تھے۔

"آجا بھائی۔ ۔ ۔ ۔" ایک دیہاتی جس کے کندھے پر لٹھ تھا للکارا تینوں انسان سہم گئے۔ "آجاؤ چور پکڑا گیا"۔

"اچھا! ۔ ۔ ۔" آوازیں گونج گئیں۔ تینوں کو ایک گھیرے میں لے لیا گیا۔ "بھاگ رہی تھی کلنکن"۔ "عشق کرنے چلی تھی سُسری"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "ہیر رانجھا۔ ۔ ۔"

"کیوں بے رانگا"۔ ایک آدمی نے رانگا کے ہاتھ کو پکڑا! ۔ ۔ ۔ ۔ "کیوں بے

چھوکری کو بھگا کر لایا"۔

"بھیا مجھے کیوں پکڑتے ہو ناحق ..... بھلا میں کیسے گاؤں کی لڑکیوں کو بھگا کر لے جاتا۔ یہ بابو صاحب ..... یہ بابو صاحب کے ساتھ بھاگی جا رہی تھی ....."

"اچھا چلئے بابو صاحب ....." اُجڈ اور گنوار ہاتھوں نے ونود کی گردن ناپی۔

"سنبھل کر۔ بابو صاحب کو گاؤں لے چلو۔ پنچایت فیصلہ کرے گی۔ چل ری چھوکری ..... چل!"

نینا رو رہی تھی۔ اُسے رانگا سے اتنی اُمید نہیں تھی۔ انسان مجرم کے بھیس میں کتنا بزدل بن جاتا ہے۔ رانگا ..... نینا نے محسوس کیا رانگا کی بانسری ٹوٹ گئی ہے، وہ اسے اب بجا نہیں سکتی۔ ایک زبردست اور خوفناک مستقبل نے رانگا کے خیالات کو تبدیل کر دیا۔ نینا روئے جا رہی تھی۔ اُس نے ایک نئی دُنیا کا خواب بسایا تھا، برگد اور دیودار کے درختوں کے سایہ میں بسنے والی دُنیا کا خواب۔ رانگا کو اپنے زانوؤں کا سہارا دیکر تھکن دُور کرنے کا خواب ..... جنگلی پھول ایک دوسرے سے محبت نہیں کر سکتے۔

ونود چُپ تھا۔ وہ ان اُجڈ گنوار لوگوں سے یہ کہہ سکتا تھا۔ اُس کی عقل اُن پر کس طرح غالب آسکتی تھی۔ ونود۔ رانگا۔ نینا ..... عجب مجموعہ .....

گاؤں میں پنچایت لگی۔

صدر اپنی جائے نشست سے کھڑے ہوئے۔ "بابو صاحب کو پنچایت کے سامنے پیش کرو۔"

ونود سر جھکائے پیشی میں کھڑا ہو گیا۔

"اچھا!" صدر نے حقّہ کا ایک کش لگا کر فرمایا۔ "اچھا بابو صاحب! پہلے یہ بتاؤ کہ تم مَنیا کو کتنے دن سے جانتے ہو۔ سچ سچ بتانا۔ پرماتما کا انصاف سُنا ہے۔ . . . ."

"ہاں! میں نے پرماتما کا انصاف سُنا ہے پنچ مہاشے . . . . میں اس لڑکی سے تو کیا گاؤں تک سے واقف نہیں۔ رانگا مَنیا کو بھگائے جا رہا تھا۔ اُس نے میرے سامنے اپنی محبّت کا اعتراف کیا۔ رانگا مَنیا سے محبّت کرتا ہے۔ یہ تم خود اُن کے دل سے ہاتھ لگا کر پوچھ سکتے ہو . . ."

"بابو صاحب ٹھیرئیے . . . . چھوکری کو پیش کرو۔ کیوں ری! تو رانگا کے ساتھ بھاگ نکلی تھی۔ ایں! گاؤں کی لاج اتنی سستی . . . . سچ بتا . . . ."

پنچایت میں ہلکی سی آوازیں بیدار ہو گئیں۔ رانگا اُٹھ کھڑا ہوا۔

"پنچ مہاشے . . . . صرف دو بات . . . ."

"کہو"

"کاکا شہر کے آدمی بہت چالاک ہوتے ہیں۔ اور گاؤں کی لڑکی ان بیچاروں کے دھوکہ میں آجاتی ہے۔ مَنیا پاگلوں کی طرح بابو صاحب کے پیچھے جا رہی تھی بالکل پاگلوں کی طرح . . . . میں نے بابو صاحب کو روکا اور گاؤں کی طرف ہی لا رہا تھا . . . ." رانگا ہانپ سا گیا۔ اس کی پیشانی پر پسینہ نمودار ہو گیا۔

اُس کو پوچھا۔ ۔ ۔ ؛ ہاں! تو یہ نادان لڑکی، پگلی سی بابو صاحب کے ساتھ دیوانی سی بھاگی جا رہی تھی "۔

نَینا خاموش تھی۔ وہ ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا تھی۔ اُس نے نیلے آسمان کی طرف دیکھا۔ اسے محسوس ہوا کہ ساتھی پرندے نے اپنی محبوبہ کو تنہا پھڑ پھڑانے کے لئے چھوڑ دیا ہے اور اُس پرندے کے پَر ہوا کی تیزی سے کٹ سے گئے ہیں۔ اُف ۔ ۔ ۔ ۔ نیلا آسمان، رانگا، بانسری، اور وتود ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ برگد اور دیودار کے درختوں کے سایوں میں ایک نئی دُنیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دماغ کے سامنے دُھندلا دُھندلا ماحول۔ چکر، دائرے ۔ ۔ ۔ ۔ نَینا کو غش آگیا پنچایت میں کھلبلی سی مچ گئی ۔ ۔ ۔ ۔ لوگ نَینا کو ہوش میں لانے کی ترکیبیں کرنے لگے۔

" دیکھا پنچ مہاشے " رانگا نے کھڑے ہو کر کہا۔ " نَینا کو اپنی غلطی کا کتنا غم ہے۔ جنگلی پھول، بابو صاحب جنگلی پھول توڑ کر سونگھنا چاہتے تھے۔ پہلی ہی ملاقات میں لڑکی کا دل موہ لیا۔ بے چاری گاؤں کی لڑکی ۔ ۔ ۔ ۔ "

نَینا ہوش میں آگئی تھی۔

" نَینا سچ بتا کیا قصہ ہے۔ آدمی بعض دفعہ بہت چالاک بن جاتے ہیں "۔

" پنچ مہاشے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پنچ مہاشے۔ پرماتما مجھ کو، تم کو سب کو دیکھ رہا ہے۔ گنگا جلی ہو تو میں قسم تک کھا سکتی ہوں۔ گنگا ماتا کی قسم بابو صاحب نردوش ہیں۔ نردوش ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رانگا " نَینا کی بھویں پلکوں پر جھک گئیں۔ اُس کے رخساروں میں شفق کا شہابی رنگ اُبھر آیا۔ " میں رانگا کو چاہتی تھی اُس نے دریا پار بانسری بجائی اور میں اُس کے پیچھے پیچھے چل دی "۔

"غلط . . . جھوٹی" رانگا نے غصّہ کا اظہار کیا "سفید جھوٹ کاکا بالکل سفید جھوٹ"۔

"لڑکی کو اپنا بیان جاری رکھنے دو۔ خاموش . . . ."

"کاکا . . ." ننیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے "کاکا میں رانگا کو چاہتی تھی وہ مجھ کو ایک نئی دُنیا میں لئے جا رہا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ہم دونوں مل کر ایک نئی دُنیا بسائیں گے۔ برگد و دیوار کے سایوں تلے . . . ." "آنسو، غم کے موتی" بابو صاحب زیرِ دوش ہیں"۔

"اُونہہ" پنچ مہاشے نے اپنی ناک بھوں چڑھائی "نئی دُنیا۔ لڑکی تو کوی بن گئی ہے۔ کتنی بھولی بن چلی ہے . . . . چل بیٹھ . . . . بابو صاحب صاف قصّہ بتا دیجے۔ گاؤں کا انصاف شہر کے انصاف سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ یہ ہم سب انسانوں کا انصاف ہے"۔

ونود کھڑا ہو گیا۔ ایک عظیم مورت، اس کی آنکھیں اُداس تھیں۔ وہ ایک عجیب گروہ میں پھنس گیا تھا۔ ایک عجیب ماحول، اُس گروہ کی آنکھوں میں وائتی شبہ تھا۔ دیہات والوں کی آنکھیں شہر والوں میں صرف ریاکاری جیلسازی فریب اور دغابازی کے اور کچھ دیکھ نہیں سکتی۔ ونود کا دل سسک رہا تھا۔ شاعر کا دل . . . . وہ اپنے جذبات کی دُنیا میں ایک نئی تصویر بیدار کرنا چاہتا تھا۔ ایک دم مختلف تصویر . . . . . وہ پُرانے خداؤں کو نئے زمانہ میں نیا چولہ بدلوانا چاہتا تھا۔ اُس نے چٹان پر ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں بیٹھے بیٹھے رانگا اور ننیا کے لئے ایک نئی دُنیا کی تشکیل کے بارے میں سوچا تھا۔ خواہ وہ برگد اور

دیودار کے سایہ تلے ہو یا اُس کے کنج عزلت میں۔ شاعر کا خیال، نئی دنیا.....
اور وہ کند پھاوڑے سے اُس چٹان کو توڑنا چاہتا تھا جو شاعر کو "بے عمل" کے
نام سے چڑاتی ہے۔ شاعر بے عمل۔ اُف..... ونود نے اپنی پیشانی پر تین
انگلیوں کو پھیرا۔ پسینے کے قطرے زرد مٹی میں گر کر جذب ہو گئے۔ اُف! شاعر
اور چٹان۔ اور اس کی ایک نئی دنیا..... جو وہ رانگا اور ننیا کے واسطے برگد
اور دیودار کے درختوں کے سایہ میں یا اپنے کنج عزلت میں بسانا چاہتا تھا۔ بھورے
بادل آسمان میں تیر رہے تھے۔ ہواؤں نے اُن بادلوں کا سارا رس چوس لیا تھا...
"پنچ مہاشے۔ تمہاری آنکھ پتہ دے رہی ہے کہ تم کو شہری پر شک ہے۔
ضرور اس بات سے انکار نہیں۔ میرا دل صاف ہے۔ قطعی صاف ستھرا۔ میں
ایک چٹان پر جو کہ اُس دریا سے جو تمہارے گاؤں کے نزدیک سے گزرتا ہے،
شاید چھ یا سات میل دوری پر ہے بیٹھا ہوا تھا۔ پھر رانگا آیا اور ننیا کے
ساتھ...... وہ دونوں ساتھ گاؤں سے بھاگ کر آئے تھے وہ دونوں ایک
نئی دنیا بسانا چاہتے تھے...... پھر میں اُس چٹان سے اُترا ان کو دیکھ دی
یہ گھبرائے۔ کچے پودے بھرے معصوم پروانے۔ لیکن میں سمجھتا تھا کہ ننیا اور رانگا
دونوں کو چاہتے ہیں۔ ان دونوں میں راستہ میں اس بات کا اعتراف بھی کیا۔
اور پھر......" ونود کے چہرے پر ایک روحانی نور دوڑ گیا۔ بھورے بادل
اَب بھی آسمان میں دوڑ رہے تھے۔ اور پھر....." اور پھر شاعر کا دل جاگ
اُٹھا۔ اُس کے جذبات نے اس کے خیالات پر قابو پا لیا۔ اور پھر میں نے
سوچا یہ دونوں جہاں بھی جائیں گے پکڑے جائیں گے، ان کا جرم.... نہیں

ان کا جرم نہیں بلکہ گاؤں والوں کی نگاہوں میں ان کا جرم کھٹکے گا۔ اور گاؤں کا انصاف ان کو کہیں کا نہ رہنے دیگا۔ میں ان کے لئے وہ دنیا مہیّا کرنا چاہتا تھا جس کی ان دونوں کو ضرورت تھی۔ برگد اور دیودار کے درختوں کے سایہ تلے ایک نئی دُنیا . . . . .“ ونود کا سانس اُکھڑنے لگا۔ بس بیچ میں بہلتے بس آگئے کیا کہوں۔"

رانگا پھر کھڑا ہوا۔ ”شہر والوں کی زبان کا اعتبار کیا۔ کاکا! کاکا سُنتے ہو۔ اُس گاؤں میں جہاں عزّت کے نام پر نوجوان اپنی گردن تک کٹوا دیں بھلا ایسا کرم ہو سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میرا لٹھ ہاتھ سے چھوٹ کر گھاٹی میں کھو گیا نہیں تو میں اس آدمی کو وہیں ختم کر دیتا۔“

”ٹھیک ہے۔ رانگا ایسا ہرگز نہیں کر سکتا۔ رانگا نے ٹھیک کہا ہے۔ نینا نے اپنے گاؤں کی لاج کھو دی ہے . . . . سُسری . . . . شاعر کے ساتھ عشق کر رہی تھی۔ ایک نئی دُنیا بسانے۔ برگد اور دیودار کے درختوں تلے . . . . ہاہا ہو ہو . . . .“

”خاموش! بھائیو خاموش . . . . .“

نینا رو رہی تھی اُس کے دل پر ایک چٹان ٹوٹ پڑی تھی۔ ونود بے بس تھا۔ اُس کے شعور کے ہاتھوں میں ایک کند پھاوڑہ تھا جو اُس چٹان کو توڑ دینا چاہتا تھا جو انسانی ترقی کے ہر ایک کام میں حارج ہے اُف کتنی سخت ہے وہ چٹان، وہ محض جذبات کے کُند پھاوڑے سے نہیں بکھری جا سکتی۔ اس کے ہاتھوں نے محسوس کیا کہ وہ دو انگلی پھول جن کو اُس نے آپس میں ملانے کی کوشش کی تھی کانٹا بن کر اس کی نازک ہتھیلیوں میں چُبھ رہے ہیں۔ اور وہ اس چٹان کو

ہرگز نہیں توڑ سکتا وہ صدیوں سے قائم ہے اور قائم رہیگی ۔ پرانے خدا ایک دم مستقل ہیں۔ انہیں نئی بات بالکل نہیں بھاتی ۔ شاعر کی دنیا بے عمل انسان کی دنیا ہے۔ اس دور کا خیال جو صدیوں آگے ہے ۔ صدیوں آگے ۔ ۔ ۔ ۔ صدیوں بیتنے پر بھی شاید رانگا اور ننیا برگد اور دیودار کے سایوں میں ایک نئی دنیا بسانے میں کامیاب نہیں ہونگے۔
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ننیا وہ اس بھیڑ کی آنکھ بچا کر ایک درخت پر چڑھ رہی تھی برگد کا درخت ۔ ۔ ۔ ۔

پنچ مہاشے نے کہا ۔ ۔ ۔ ۔ فیصلہ ۔ پنچایت کا فیصلہ سننے سے پہلے کچھ کہنا چاہتے ہیں بابو صاحب ۔ ۔ ۔ ۔" "کچھ نہیں"

"بابو صاحب کی کمر پر سو کوڑے لگائے جائیں ۔ بس اور پھر ان کو گاؤں کی طرف سے پیٹھ پھیر کر شہر کی طرف بھاگنے کی اجازت ۔ ۔ ۔ ۔

"ہاہاہا ۔ ۔ ۔ ۔ " رانگا ہنس دیا ۔ "ہاہاہا ۔ ۔ ۔ ۔"

ایک ! دو !! تین !!! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ایک شور " بھاگنا ۔ دوڑنا ۔ ۔ ۔ ۔ غضب ہو گیا ۔ ظلم ہو گیا پرماتما ۔ ۔ ۔ " ایک عجیب ابتری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "کیا ہوا"

"کیا ہوا" پنچ مہاشے نے پوچھا ۔

ننیا نے درخت پر چڑھ اور پتھروں میں کود کر جان دیدی"۔

"عجیب ۔ ۔ ۔ ۔ بابو صاحب کو بہت سزا مل چکی ۔ جایئے ۔ ۔ ۔ ۔ "

ونود ہنس دیا ۔ "خوب ! ۔ ۔ ۔ ۔ " گاؤں کے لوگ اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے ۔ ایک غیر متوقع واقعہ نے انکو سراسیمہ کر دیا تھا ۔ ونود جلدی جلدی گاؤں سے نکل کر بھاگا جا رہا تھا اپنے خداؤں کے قہر سے دُور ۔ اور چٹان جسکو اس نے توڑنے کی کوشش کی تھی اب کتنی مستحکم ہو گئی تھی

"ایشیا" نومبر ۱۹۴۲ء

صبح سے شام تک

وہ اب بیکار تھا۔

شام کو جب وہ اپنے کام کو چھوڑ کر چلا تھا تو وہ ایک دم ٹھٹک سا گیا تھا۔ وہ سڑک جس پر وہ ہر روز لاپروائی اور فراغت کے قدم اُٹھاتا، سڑک پر پڑے ہوئے ڈھیلوں کو لڑھکاتا، دکانوں پر تنقیدی نگاہیں ڈالتا چلتا تھا، اب سُونی سُونی معلوم پڑی۔ بالکل بدصورت۔ اُس عورت کی مانند، جو سیاہ فام ہو، چیچک کے ستاروں نے آسمانِ خوبصورتی پر چار چاند لگا دیے ہوں۔ اور جو اندھیری رات میں دانت پھاڑ کر بجلی کی روشنی میں بہادر سے بہادر انسان

کو ڈرا دے اور مجسم ارتعاش بنا دے۔ سویرے کی وہ دلہن، نکھری ہوئی دوشیزہ، مست شباب اور مخمورِ حسن، اتنی جلدی بوڑھی ہو چلی، اُسے رہ رہ کر تعجب ہو رہا تھا۔ سڑی بسی دکانیں، کوڑا کرکٹ غلاظت، میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے بچے، سیاہی مائل دیواریں، اُسے نفرت کا جذبہ برابر انگیختہ کئے جا رہا تھا۔ یہ شہر ہے اور شہر کی رونق - اور وہ ان چیزوں کو دیکھ کر بار بار ناک بھوں سکیڑے جا رہا تھا! کیسا انتظام ہے؟ شہر کے نمائندے تو بن جاتے ہیں، مگر گدے دار کرسیوں اور بجلی کے پنکھے کی ہوا کھا کھا کر حفظانِ صحت کے اصول، صفائی اور شہر کی بہتری کی سینکڑوں باتیں بھول جاتے ہیں۔ جب بازاروں میں اتنی گندگی ہو تو گلیوں کا کیا کہنا۔ جہاں دیکھو بیماری کے جراثیم۔ آخر ان جراثیم کو ہلاک کیوں نہیں کر دیا جاتا۔ ان بچوں کو ہی دیکھو، بال پریشان، منہ پر مکھیاں بھنکتی ہوئیں، سیروں میل، ریت اور مٹی میں لتھڑے ہوئے۔ ان کی مائیں منہ دھونا تک نہیں جانتیں، دنیا میں لاتے ہی سڑکوں، بدروؤں، گیلی آمیز گلیوں میں آوارہ گردی کرنے، اِدھر اُدھر کی سینکڑوں بری باتیں سیکھنے کے لئے چھوڑ دیتی ہیں۔ کیا کہنے، صاحبزادے کے بدن پر مکمل لباس تو درکنار پھٹی پرانی لنگوٹی شرم ڈھانپ رہی ہے۔ اور حضرت کے منہ میں ادھ جلا سگرٹ، جو کوئی شوقین مزاج انسان پیتے پیتے پھینک گئے ہوں گے، اٹھا، اور سڑک کے کنارے پڑے ہوئے چوکھونٹے پتھر پر بیٹھ آرام سے کش پر کش لگا رہے ہیں۔ ان کا انداز، پینے کا ڈھنگ کسی آزاد سلطنت کی کابینہ کے ذمہ دار رکن سے کم نرالا نہیں۔ اور اسی سگرٹ کے دھوئیں میں وہ میلی کچیلی چار چار پانچ پانچ سالہ لڑکیوں کو رومان کا سبق پڑھاتے ہیں اور وہ

معصوم ریت اور مٹی کے چیپٹ جانے سے زنگ خوردہ چہرے ان حضرت کے
گرد منڈلاتے رہتے ہیں۔ کرنجی پتلیاں، ریت کے رنگ والے سنہرے بال، کالے
کالے پاؤں اور بے ڈھنگے پنجے . . . .،

بڑے میاں نے مرغی کو ٹانگ سے پکڑا۔ اور بسم اللہ . . . . لیکن ان
سڑی بسی گلیوں میں اس نے ایسی ہی سینکڑوں مرغیوں کو کٹتے ہوئے دیکھا ہے۔
بھوری بھوری چھریاں ہوتی ہیں اور مرغیاں ان کے تلے ایک منٹ نہیں دو منٹ
نہیں ہفتے دو ہفتے اور کبھی کبھی سالوں تڑپتی رہتی ہیں۔ بال و پر نوچ ڈالنے
کے بعد بھی وہ تڑپتی رہتی ہیں۔ اس نے اُن کو روتے ہوئے تک سُنا ہے۔
چیختے چلاتے، پھڑکتے پر پھڑپھڑاتے نزع کی حالت میں آسمان کی طرف التجا
اور رحم کے دیوتاؤں کو پکارتے ہوئے دیکھا ہے۔ لیکن التجا، التجا کرتے ہوئے
اُن کی زبان لڑکھڑاتی ہے۔ اور رحم وہ اب بوڑھا ہو چلا آخر صدیوں سے
اُس نے اپنی روح کو مقیّد رکھا ہے نا۔ اور بزرگ جاندار کا دماغ ہمیشہ مضمحل،
ناکارہ ہو جایا کرتا ہے۔ بلکہ وہ سٹھیا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب ہم جوان تھے
تو ہم نے بھی انصاف کو پکارا تھا، رحم سے التجا کی تھی۔ لیکن . . . لیکن کیا؟
ان کی کسے نے نہ سُنی۔ تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ اگر وہ گلیوں میں تڑپتی ہوئی ہستیوں
کے گلے پر چھری پھرتے دیکھ کر نہ بچا سکے تو کیا اب بھی مرغیاں کٹتی رہیں گی۔ سراسر
ظلم ہے۔ اور وہ چھری اُس کے ہاتھ میں پہنچتی ہوئی دکھائی دی۔ کیا ہرج
ہے، جب دنیا کا دستور یہی ہے تو وہ کیوں نہ اپنی چھری کو پہلے سے تیز کرے۔
کس لیے، کس واسطے۔ کسی غریب، معصوم، شریف، حیادار مرغی کی گردن پر بھونڈے

انداز سے پھیرتے رہنے کے لئے، تڑپتا ہوا دیکھنے کے لئے۔ موت اور زندگی میں کشمکش کے رقص سے لطف اندوز ہونے کے لئے۔ حتیٰ کہ وہ مرغی سرد ہو جائے ....

اور بڑے میاں کی مرغی بھی تو سرد ہو چلی اور اس کے بعد۔ کچھ نہیں وہی دن اور وہی رات۔ سڑک، مکانات، کلب، سنیما ہال، تماشہ، ناچ اور جینے کیا گیا۔ اور جب وہ صبح اپنے گھر سے چلا تھا تو اس کے خیالات سو رہے تھے یعنی اس کا دماغ آرام کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے یہ سب چیزیں آئی ضرور مگر اُسے اُن سے کیا سروکار۔ نہ اُس نے قدم گنے، نہ کسی شے سے ناراضگی کا اظہار کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اس وقت شہر کے نظام، صفائی، چہل پہل سب سے مطمئن تھا۔ ایک دم خوش۔ اُسے رہ رہ کر تعجب ہو رہا تھا کہ آج غیر مترقبہ طور پر قدرت کیوں اتنی نکھر چلی ہے نیلا آسمان، صاف شفاف، شہر پر تنبو تانے ہوئے۔ لطیف دھوپ اور اُس کے سنہری بالوں میں چمکتی ہوئی عمارتیں۔ سڑک کے دو رویہ جھومتے ہوئے درخت، صاف پٹری، دُھلی دُھلائی سڑک، خاموشی، ٹریم گاڑی اور موٹر کاروں کے ہلکے لطیف مست کُن نغمے، جمنا اشنان سے واپس مُڑتی ہوئی عورتیں اور سکول جانے والی لڑکیوں کے اُجلے لباس۔ اُسے یہ سب چیزیں نہایت پسند تھیں۔ اُس کے بدن پر گھٹیا کپڑے کا سوٹ ہی کیوں نہ ہو مگر تھا وہ صاف و شفاف۔ صفائی پسند تو وہ شروع سے ہی تھا۔ اور گلی سے نکلتے ہی اُس نے داروغہ صفائی کی سقوں اور بھنگیوں کو ڈانٹ ڈپٹ دیتے وقت خاموش داد بھی دی تھی۔ اور شاید وہ سوچ بھی رہا تھا کہ بغیر دھمکائے سالے کام ہی نہیں کرتے۔ اگر اس طرح کام چلے تو شہر کی تمام

غلاظت، گندگی دُور ہو جائیے، تپ دق، سل آخر پھیلے کیوں۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے اور وہ چُپ چاپ داروغہ صفائی کے اسلوبی کار کو دیکھ کر رُکا بھی تھا۔ لیکن وقت کی دقّت کی وجہ سے اور اس ہجوم سے گھبرا کر وہ آگے بڑھ گیا۔

ایک!

دو!!

تین!!!

بس! وہ آدمی بھی عجیب بیوقوف معلوم ہوتا تھا صرف تین گرم طمانچوں پر ہی اکتفا کیا۔ آجکل کے بچے بہت بگڑ چکے ہیں۔ بزرگوں کا کہنا نہیں مانتے۔ بچہ بسور بسور کر رونے لگا۔ ہوگا کوئی نو دس سال کا۔

"ابے پھر کھیلے گا گولیاں۔ شرم نہیں آتی دُکان پر ایک منٹ نہیں ٹکتا۔ بول نہیں تو لگاؤں ایک چپت"۔

"نہیں۔ اُوں۔ اُوں۔ اُوں" اور ساتھ ہی وہ اپنی کنپٹی کو آگے کئے دیتا تھا۔ تاکہ اس کے باپ کا بھرپور ہاتھ اس کے چہرے کو کسی کشمیری دوشیزہ کے سیب ایسے رنگت والے رُخساروں ایسا نہ بنا دے۔ اور اس معصوم سرزمین میں ایک کے بعد دوسری گلاب کی کلی نہ چٹکنی شروع ہو جائے۔

"ابّا۔ میں اب . . . میں اَب نہیں کھیلوں گا۔ وہ لالہ کا لڑکا تو دن بھر کھیلتا رہتا ہے۔ صبح سے شام تک . . . . ." اور اُس نے آستین بھرے ہاتھ سے آنسوؤں کا پوچھنا شروع کر دیا۔ آستین گیلی ہو چلی۔ مگر ابّا کا غصہ ابھی اُترتا ہوا نہیں معلوم دیتا تھا۔

ابا نے دونوں ہاتھوں کو آگے بڑھایا۔ لڑکے کے کان مسلتے ہوئے۔
" امیر زادے تو اُس لالہ کے لڑکے کی برابری کریگا۔ ایں! دن بھر کھیل ہی کھیل مفت کھانا مل جاتا ہے نا۔ کھانا کھایا اور دن بھر کھیل کود میں گنوا دیا۔ ناخلف، تجھے شرم نہیں آتی چل بیٹھ جا کر دکان پر۔ ۔ ۔ ۔ ۔"
پہلے معصومیت گالوں پر گلاب کے پھول بن کر نمودار ہوئی اور اب وہ کان کرن کے پھول کی سُرخ پتیاں بن چلے۔ لڑکا برابر کان درست کئے جا رہا تھا۔ ہوئے ہوئے اُن کو دبا رہا تھا۔ اور آبا کی نگاہیں ساری چیزوں کو جلاتی معلوم دیتی تھیں۔ لیکن ؟
کچھ نہیں۔ وہ صرف دیکھنے کے لئے کھڑا ہو گیا تھا۔ مگر اُسے لطف بالکل نہیں آیا۔ اس لڑکے کو سزا بہت کم ملی۔ بالکل رگڑ کر رکھ دینا چاہیئے تھا۔ کبھی گھونسا تو کبھی لات۔ تو کبھی گرم گرم طمانچے۔ اور سر پر دھپ۔ اور اگر کچھ بس نہ چلے تو کم ازکم اس کو چار فٹ اونچے پلیٹ فارم سے نیچے دھکیل دینا چاہیئے تھا۔ کیا کان مسل دیئے، بس! اُسے اچھی طرح سے یاد ہے کہ جب وہ قصبہ کے سکول میں پڑھتا تھا تو ڈاکٹر کا لڑکا خواہ مخواہ لڑکوں پر اپنی برتری گانٹھتا تھا۔ جب دیکھو اپنی شان بگھار رہے ہیں۔ اُسے یہ باتیں سُن سُن کر بہت غصّہ آیا کرتا تھا اور ایک روز اُس نے ڈاکٹر صاحب کے لڑکے کا مار مار کر بھر کس ہی جو بنا دیا۔ اس کے بعد وہ پھر کبھی نہ بولا۔ ہاں وہ بھی کم ہمّت تھوڑی ہی تھا۔ بہادر آدمی ہے ڈرنا کس لئے چاہیئے۔ ہمیشہ سر اونچا کر کے چلنا چاہیئے۔ آخر وہ بھی دوسرے انسانوں کی طرح خدا کا آفریدہ ہے۔ خواہشات، رجحانات، اور دیگر صفات کا

مالک ہے۔ اُسے ضرورت کیا کہ خواہ مخواہ دوسروں کو سلام کرے۔ یہ اُس کی زبردست توہین ہے بلکہ ہتک عزت ہے۔

اُس نے سڑک پر پڑے ہوئے روڑے کو شو کی ٹو سے ہٹ کیا۔ اور وہ دس گز کی دوری پر جا کر ٹھہرا۔ خواہ مخواہ راستے میں پڑے رہتے ہیں۔ زندگی میں رکھا ہی کیا ہے۔ رکاوٹیں ہوتی ہیں جو انسان ان کو دیکھ کر ڈر جاتا ہے وہ ناکامیاب اور جو اُن سے نہ ڈرے بلکہ ڈٹ کر مقابلہ کرے کامیاب۔ کامیاب ترین ہستی، صفحہ گیتی پر مجردہ کامیابی کا مجسمہ۔ اور لمحہ بہ لمحہ وہ تن سا چلا۔ اپنی کوٹ اور پتلون کی طرف دیکھا۔ سب دُرست ایک دم صحیح، اور اُس نے پٹری پر چڑھ پنواڑی کے قد آدم شیشے میں جھانکا۔ ایک دم دلآویز، وہ کتنا خوبصورت انسان ہے۔ کیا چہرہ مہرہ ہے اور بال بالکل اس طریقے سے سنوارتے ہیں کہ ہر عقلمند اور تعلیم یافتہ آدمی اسے دیکھ کر اندازہ لگا لے کہ نوجوان آدمی ذہین، ایک عظیم فلاسفر، کامیاب ترین نثر پرداز اور سُلجھا ہوا سیاست داں ہی۔

سڑک پر رونق ہر ساعت فزوں ہو رہی تھی۔ اور وہ برابر ہر قدم پر وقت کے ٹکڑوں، یعنی ثانیوں، ثانیہ کے بعد سیکنڈوں، سیکنڈوں کے بعد منٹوں کو دُنیا سے چھینے لئے جا رہا تھا۔ اس کے قدم نہ پھر اسی طرح سڑک پر پڑیں گے نہ ہی وہ گذرا ہوا وقت کبھی واپس ہوگا۔ ثانیے، سکنڈ، منٹ، ایک، دو، تین، چار پانچ . . . . جلدی جلدی ختم ہو جانے والے وقت کے لمحے، وقفے . . . .

ٹن ٹن . . . . ٹن . . . . ایک مرتبہ نہیں دو مرتبہ نہیں۔ دس مرتبہ گرجا گھر کا گھنٹہ خاموش ہوگیا۔

اُس نے اپنی پتلون کی جیبوں کی گہرائی میں سے ہاتھوں کو نکالا۔ دس پورے دس بج چلے۔ اور کلائی کی طرف نگاہ جو جاتی تو گھڑی ندارد۔ مگر وہ بھولنے والا انسان تو واقع نہیں ہوا تھا۔ اُف۔ سراسر محویت اور غیر حاضر دماغی۔ اُسے یاد آگیا۔ اُس نے ساری عمر گھڑی ہی نہیں باندھی۔ کلائی کی دُلہن، ٹک ٹک کرنے والی گھڑی۔ اور اُس نے کبھی بھی اس دُلہن سے التفات کیا۔ کتنا لاپروا آدمی ہے وہ۔ ہمیشہ سے ایسا واقع ہوا ہے۔ دس بج چکے ہیں۔ اور وہ..... اُسے کیا کرنا ہے۔ ارے! کلاس انتظار کر رہی ہوگی۔ جلدی جلدی سٹاف رُوم میں گھُسا، رجسٹر سنبھالا اور چاک تین چار جتنے بھی ہاتھ میں سنبھال سکا سنبھالے۔ اور خالی ہاتھ کو بالوں پر پھیرتا، سر کھجاتا، سٹاف رُوم کے میونسپل کمیٹی کی مال گاڑیوں کی سُستی مات کرنے والے گھنٹے کی طرف دیکھتا اور غیر ارادی طور سے سٹاف روم میں تشریف رکھنے والی ہر ہستی کو سلام کرتا وہ بجری کی سڑک کی چھانیوں کو چیرتا، آخر کلاس روم میں پہونچ ہی گیا۔

"بیٹھ جائیے" (انگریزی میں)

حاضری لینے کے بعد اُس نے ڈسٹر کو سنبھالا اور بلیک بورڈ کو رگڑ رگڑ کر صاف کرنا شروع کر دیا۔ اُسے ان دس مہینوں میں تختۂ سیاہ صاف کرنے کی مشق ہو چلی۔ چاک کے باریک ذرات اُس کے کوٹ کی آستینوں اور سر کے بالوں میں چھپنے لگے۔

اُس نے کوٹ کی آستین کو ہلکے ہلکے جھٹکا اور پھر کلاس کی طرف ایک نظر دوڑا کر:۔

"کوئی مشکل پیش آئی آپ کو" کتاب کو کھولنا شروع کیا۔ "صفحہ ۲۳۱، میرے خیال میں یہی صفحہ ہے۔ کوئی مشکل . . ."

"سر . . ."

"معاف فرمائیے، کہیے کیا کہنا چاہتے ہیں آپ" وہ بولا۔

"آج آپ کا آخری لیکچر ہے۔ آپ پھر اس کالج میں آئیں گے"۔

"اوہ ۔ مجھے تو اُمید نہیں۔ کچھ ایسا ہی ہے۔ اچھا کوئی سوال پوچھنا ہے آپ کو"۔

"جی نہیں"۔

آخر وہ کتنا غیر حاضر دماغ واقع ہوا تھا۔ اُسے خیال تک بھی نہ تھا کہ آج اس کا آخری دن ہے۔ وُہ کرسی پر مضمحل سا ہو کر بیٹھ رہا۔ کتاب کو غیر ارادی طور سے ہاتھ میں سنبھالا رجسٹر کو بغل میں دبایا۔ کوٹ پر جمے ہوئے چاک کے ذرّات کو جھاڑا۔ رومال سے منہ صاف کیا۔ "اچھا تو آپ لوگ جا سکتے ہیں"۔

سُست قدم۔ کتنے مُردہ اور خالی از زندگی۔ ہر ایک صدا، طالب علموں کا شور وشوغا اُس کے تخیّل کو درہم برہم کرنے لگا۔ کیا اتراتے ہوئے چلتے ہیں بجری کی سڑک پر . . . . کیا ہرج ہے کسی روز بڑے آدمی بن جائیں گے۔ ہندوستان کے نام کو چار دانگ عالم میں بلند و بالا کردیں گے۔ کالج کے طالب علموں کی طرز گفتگو، طالبات کا لباس اور نزاکت بھرے قدم، سب مصنوعی۔ لمبی اونچا کالر کیا اور لگے اترا کر چلنے۔ اور لڑکیاں اُن کے دماغ ہی نہیں ملتے، کتنی قنوطیت، جذبۂ برتری کی حامل ہیں وہ ۔ وہ چھ سال کالج میں پڑھا مگر ان چھ سالوں میں

اس کے دماغ نے جواب دے دیا۔ آخر وہ کب تک سوچتا رہے کہ اسے بننا کیا ہے۔ اور اس ساتویں سال کے بعد اُسے پھر محسوس ہوا کہ وہ سات سال..... سات سال جن میں وہ گم سا ہو چلا تھا کیا وہ پھر واپس آسکیں گے۔ لوگ کہتے تھے کہ کالج کی زندگی بہت پُر لطف ہوتی ہے۔ مگر اُسے وہ لطف وہ مزا کبھی حاصل ہوا؟ کبھی نہیں ہوتا بھی کیسے۔ کلاس رُوم سے سٹاف رُوم تک جاتے جاتے چہرہ پژمردگی کا شکار ہو چلا۔ مگر اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور کونے میں پڑی ہوئی بینت کی کُرسی پر جا ڈٹا۔ گدّے دار کرسیوں کا اُسے حق ہی کیا ہے۔

سٹاف رُوم سے ملحق لڑکیوں کے کامن روم سے آنے والی آوازیں، سٹاف روم کے گھنٹے کی بے معنی ٹک ٹک، اور سینیر لکچراروں کی بڑی بڑی باتیں ..... یا خدا! وہ سر جھکا کر سوچنے لگا اُس کے جذبات کیوں اتنے مُردہ ہو چلے ہیں۔ وہ کیوں نہ ان پروفیسران کی پُر لطف گفتگو میں برابر کا حصہ دار بن جائے۔ اُن سے دریافت کہ ان کی خوشی کا راز کیا ہے۔ وہ کیوں مطمئن ہیں۔ وہ گفتگو کر سکتے ہیں اور کبھی کبھی ہنسنے لگتے ہیں، اور جب کبھی سٹاف روم کے دروازے پر کوئی لڑکا اُن کا متلاشی ہوتا ہے تو اُس کے ساتھ تمکنت کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ آخر اُس کی زندگی کا مقصد، اور منتہائے مقصود کیا ہے۔ کچھ نہیں۔ تھوڑے دن میں وہ لکھا پڑھا سب بھول جائے گا۔ ایک دم ..... دُنیا کہے گی کہ ایک ذہین آدمی بیکار ہو گیا۔ عجب احمق ہیں ہنسنے والے بھی۔ ارے ذہانت کا پیسہ تھوڑا ہی ملتا ہے۔ پیسے کو پیسہ کماتا ہے۔ جہاں کہیں تم چلے جاؤ۔ بیت العلوم، دارالفنون، ہر جا، ہر جگہ پیسے کو پیسہ کماتا ہے۔ ذہانت خریدی جا سکتی ہے،

بڑے آرام کے ساتھ - اور تو اور اُسے یاد نہیں رہا - کیا نام . . . اس کا دماغ
اتنا کیوں ماؤف ہو چلا - اُسے آخری ٹیوشن کے پیسے بھی وصول کرنے ہیں -
مگر وہ کیسے وصول کرے گا - جب وہ کالج سے فراغت پا چکا تو پیسوں سے
بھی ہاتھ دھو لینا چاہیئے -

سٹاف روم کا گھنٹہ برابر ٹک ٹک کئے جا رہا تھا - مگر پیہم، متواتر،
آخر کب تک، جب تک اس سٹاف روم میں نئے چہرے آئیں گے اور چلے جائینگے
کورٹ یارڈ میں گلاب، موتیا، اور سنبل کے پھول کھلتے ہیں - شہتوت کے
درخت ہرے ہرے شہتوت پھلیں گے اور اس بجری کی سڑک پر کھلتے ہوئے
چہرے اور ہنستی ہوئی دوشیزائیں پُر از اُمنگ قدم رکھتی ہیں - اور وہ . . . کچھ نہیں -
کالج کا بہترین طالب علم ہوتے ہوئے بھی اب ایک بیکار انسان بن جائے گا -
اور سٹاف روم کے ساکنوں کے سامنے آتے ہیں شرم محسوس کرے گا - انتہائی
شرم و حیا . . . . ذہانت شرمیلی ہوتی ہے - اور خوبصورتی، اصلی خوبصورتی وہ
بھی شرمیلی ہوتی ہے - بالکل حیا کی دیوی اس کی . . . . نہیں دس مہینے تک
اس کی خاموش مددگار - نلیما بھی تو کتنی شرمیلی ہے - نہایت شرمیلی - جب وہ
اس کے مطالعہ کے کمرے کے سامنے سے گذرتی ہو تو اُس کے رُخسار تمتما جاتے
ہیں اور اس کی نگاہیں ایک دم جُھک جاتی ہیں - اور اس کے دل کے تاروں
میں جھنجھناہٹ پیدا ہو جاتی ہے . . . . سوچتے سوچتے اس کے رُخساروں پر
حیا کی سُرخی دوڑنے لگی - نہیں سٹاف روم کی جہاندیدہ آنکھیں اُس کے چہرے
سے اندرونی حالات کا پتہ نہیں لگا سکتیں - اور بیت کی کُرسی، وہ بھی اتنا حساس

دل نہیں رکھتی کہ اس کے دل کی ٹِک ٹِک کو سُنے ۔ دھک، دھک ۔۔۔۔۔
دھک ۔۔۔ دھک ۔۔۔"

اُف وہ کس قدر کمزور انسان ہے ۔ بیکاری اور محبّت ۔۔۔۔ بیکاری کے دنوں میں محبت یا پھر بیسویں صدی کی اختراع رومان یعنی صرف زیارت کا طلبگار ہونا ۔ خیر وہ متفقہ طور پر نہیں کہہ سکتا کہ یہ محبّت انیسویں صدی کے پاگل پن کی حد تک پہونچانے والی سودائیت ہے یا وقت کی لپیٹ میں آکر ڈھل جانے والا رومانی جذبہ ہے ۔ لیکن نہیں! اس کی یہ محبت یا پھر رومان ایک عجیب قسم کا رومان ہے ۔ شام کے سایوں میں پہاڑی کے دامن میں بسی ہوئی جھیلوں کے پانیوں ایسی خموش زندگی میں لطیف جذباتی آغوش میں پلا ہوا جذبہ ۔ جس نے اس کو اتنی بلندی پر پہونچا دیا کہ اُسے ہر شئے سے محبت ہو گئی ۔۔۔ ارے! آخر وہ اتنا کیوں کھو چلا ہے ۔ وہ ایک دم اُٹھا اور سٹاف روم کے گھٹنے کی سُست مگر معنی خیز آنکھوں کو دیکھتا ہوا سکڑتا سکڑتا آتا، لرزتا سا، بچتا بچاتا آخر وہ سٹاف روم سے باہر نکل ہی گیا ۔ ہر لمحہ نلیما کا خیال اس کے دل کی حرکت کو فزوں سے فزوں تر کئے جا رہا تھا، خیر اُس نے سٹاف روم کے سامنے لگے ہوئے باغیچے میں سے ننھّے ننھّے جامنی رنگ کے پھولوں کو توڑا اور کوٹ میں آویزاں کر لیا ۔ آخری بار، بالکل آخری بار ۔ اور جب وہ ان پھولوں کو آویزاں کر رہا تھا تو چند طالبات ادھر سے گزری تھیں، تو وہ ہلکی ہلکی سی شرم محسوس کرنے لگا تھا ۔

"نمستے"

" نستے ۔ کہئیے کیسے مزاج ہیں آپ کے "۔

" عنایت ہے۔ تو آپ اب پھر کالج میں نہیں آئیں گے۔ آپ جیسا لائق انسان، آپ ہم کو بہت یاد آئیں گے "۔

" شکریہ۔ لیکن مجھے کچھ پریشانی نہیں۔ اس سات سالہ زندگی کا مجھ پر بوجھ ہے۔ اُتار پھینکوں گا جلد یا دیر میں۔ اور کام' کام میں نے سوچ لیا ہے۔ نہایت عمدہ " اور کوٹ میں آویزاں پھول ہنستے ہوئے معلوم پڑے۔

" کیا کام؟"

" یہی۔ قلم اور کاغذ۔ سویرے سے شام تک لکھتے رہنا۔ ڈرامے' افسانے اور کیا کروں "۔

" عجیب "

اس میں تعجب کی بات ہی کیا ہے۔ پانچ سال حساب پڑھا۔ اور اب لٹریچر کی دُلہن سے دوستی گانٹھ لی۔ تبدیلی اور زندگی کا راز تبدیلی ہے۔ کتنا اچھا combination ' ریاضی اور لٹریچر۔ . . . ہاہا ہی ہی . . . . تو آپ مجھے اس طرح تو یاد کر سکیں گے۔ اور جب چاہیں آپ میرے پاس آسکتے ہیں۔ بشوق، جب چاہو "۔

" شکریہ "

لڑکا چلا گیا۔ اُس کا محبوب ترین طالب علم۔ مگر اُسے کبھی ہمت نہ پڑی کہ کسی سینیر لکچرار سے طالب علمی کے زمانے میں بات کرے۔ وہ ڈرتا تھا' نہیں! قطعی غلط بات۔ اس کی زندگی نے، ماحول نے سبق سکھا دیا تھا کہ رہنما کا ذرا سا

اشارہ کافی ہوتا ہے۔ اس لئے بار بار کسی مسئلے کی تہ تک پہونچنے میں ناکام ہوتے ہوئے بھی اُس نے کسی کو تنگ نہیں گیا۔ کبھی نہ کبھی وہ مشکلات کو دُور ہٹا پھینکنے میں کامیاب ہو ہی جائے گا۔ لیکن بجری کی سڑک دن کے دوسرے حصّے میں رنگت کھوتی معلوم ہوتی تھی۔ اور مایوس کُن نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے کان طالب علموں کی گفتگو، لکچراروں کی کمرہ در کمرہ گونجنے والی آوازوں، کالج کی گھنٹی کی ٹن ٹن، سب سے بے بہرہ ہو چلے۔ دو..... تین..... چار..... ایک کے بعد ایک پیریڈ گذر گیا لیکن وہ کونسی کلاس لے۔ وہ بھولتا جا رہا تھا اُن مسئلوں کو جو طالب علمی کے زمانے میں وہ چٹکیوں میں حل کر لیتا تھا۔ کتنی پُر اُمید زندگی تھی وہ۔ گھنٹوں کسی مسئلے پر اڑے رہنا اور جب کامیابی اپنی تمام تر رعنائیوں کو ساتھ لئے اُس کے سامنے نمودار ہوتی تو وہ کتنا خوش ہوتا تھا۔ یہی اس کی دولت تھی اور یہی سرمایہ کتنی لذیذ شے..... خیر۔ آخر ہر بات پر یہی کہنا پڑتا ہے نا۔

ڈھلتی ہوئی دھوپ میں ہر لحظہ رنگت بدلنے والی بجری کی سڑک ہر لمحہ ناامیدی اور یاس کا خاکہ بنتی جا رہی تھی۔ دس بجے اُس میں کتنی چمک تھی۔ آب و تاب، زعفران کی کھیتیاں، کالج کی دیواروں کے سائے میں پھلتی پھولتی۔ شفق کے رُخساروں ایسی رنگت اور اب وہی سڑک سیاہی مائل، کھردری، بوٹوں تلے آکر کھسر پھسر بولنے والی، بن چلی۔ اور اس سڑک پر جوتوں کے پڑنے سے پیدا شدہ آواز اس کے ضعیف دل پر بارِ گراں ثابت ہو رہی تھی۔ کتنی مکروہ آواز، گویا موسیقی کی گردنِ زار پر بھونڈی چھری پھیر دی گئی ہو، غصّہ سراسر نفرت کا جذبہ

ہر چیز سے ناراضگی کا اظہار، اور وہ اس بجری کی سڑک پر روانہ ہو گیا۔ سر جھکائے سنجیدہ فلسفی کی مانند، ہلکے ہلکے قدم رکھتا، تاکہ اُس کے بوٹوں کے دباؤ سے سڑک کی مکروہ آواز اُس کی رُوح کی گہرائی میں چرکے نہ لگانا شروع کر دے۔ مگر برابر بجری کھسر کھسر بولے جا رہی تھی۔

سڑک، گندگی اور تڑپتی ہوئی مرغی . . . اور وُہ چھری جو اُس کے ہاتھ میں آ چلی تھی۔ کیوں کس واسطے؟ نلیما کو اپنی بیٹھک میں بیٹھے بیٹھے ذبح کرنے کے لئے۔ آخر وہ دو تین بار ادھر سے گذرتی ہے نا۔ اور وہ اُسے بھی اس کا انتظار رہتا ہے۔ اور جب کبھی اُس کی مُرغی اس بکے کمرے کے سامنے سے گذرتی ہے تو اس کی ذہانت رو تی ہے۔ چہرہ رنگت بدلنا شروع کر دیتا ہے۔ اور دل ضعف ونقاہت کے آخری درجے پہ پہونچ جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ وہ نلیما کو پا سکتا ہے۔ کوئی رُکاوٹ نہیں۔ برادری ایک، ذات سب ایک، لیکن اس کے گھر میں دقیانوسی خیالات کی سلطنت ہے۔ چاندی سونے کی جھنکار کی پہچان ہے۔ اور وہ اب بیکار آدمی ہے۔ کس مُنہ سے کہے کہ اُسے نلیما کی ضرورت ہے۔ شدّت کے ساتھ چاہ ہے۔

"بیوقوف!"

نہیں وہ نہیں کوئی اور . . .

وہ دیوار کے سہارے کھڑا ہو گیا۔

"بیوقوف آخر تجھے وہ لڑکی کیوں درکار ہے۔ دیکھ دُنیا میں رکھا ہی کیا ہے۔ دوسری لڑکی کا گھرانہ مالدار۔ باپ انجینیر، بھائی تحصیلدار اور لڑکی . . . . لڑکی

خوبصورت عقلمند۔ کیا لڑکی ڈھونڈی ہے، بھونڈی شکل، کیا دیں گے اُس کے ماں باپ۔"

"جی۔ اس سے اچھا ہے کہ آپ میری شادی نہ کیجیے۔ یہ میری انتہائی بدقسمتی ہے کہ میں جو چاہتا تھا نہ ہو سکے گا۔"

"بیکاری ہی میں ایسی باتیں سوجھتی ہیں صاحبزادے۔ برادری میں ناک نہیں کٹوانی . . . ."

وہ آگے کھسکا۔ وہ بھی تو بیکار آدمی ہے۔ اور نیلما، کیا وہ اس کو پا سکے گا۔ نہیں! کیوں نہیں؟ اس کا جواب، گنبد کی بلندیوں میں گونجنے والی آواز دے سکے گی؟ کیسے وہ گنبد سے سوال کرے گا۔ کیا؟ اُسے نیلما چاہیئے۔ وہ غریب لڑکی ہے۔ اُسے پسند ہے اور وہ بیکار آدمی ہے۔ کیا جواب دے گا گنبد۔ کچھ نہیں۔ صاحبزادے بیکاری میں ایسی ہی باتیں سوجھا کرتی ہیں۔" ہاہا ہی ہی ہوہوہو. . . .

سڑک بدلی۔ سڑک کا ماحول بدلا۔ صبح شام کے سفر کو تیار۔ اُس نے مکان کی بلندیوں کو عبور کر کے کوشش کی کہ وہ شفق کے نظارے کی ایک جھلک دیکھے۔ لیکن شہر کی مہذب ہوا اور اُونچی عمارتوں سے شفق کی دُلہن شرماتی ہے۔ بیکار آدمی کو تسلی ہے تو کیا کہ وہ کم از کم قُدرت کے نظاروں سے دل کو بہلائے جب طبیعت پریشان ہو کسی پارک میں جا کر پڑ رہے۔ دریا کے کنارے دُور دُور تک چلا جائے۔ اور شفق کے عارض گلگوں کو دیکھتا رہے۔ مگر متواتر ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہے۔ اداس کے ہاتھ پرندوں کے بازوؤں کی طرح پھڑپھڑانے شروع کر دیں۔ ایک فضول کوشش میں، شفق کے عارض گلگوں کو نزدیک سے

دیکھنے کے لئے۔

لیکن صبح اتنی جلدی شام میں کیوں تبدیلی ہو چلی۔ گھر پہنچکر وہ اپنے مطالعہ کے کمرے میں گھسا۔ پہلی نظر گلی کی طرف پھیری تو نلیما گذرتی ہوئی نظر آئی۔ نلیما۔ چُھری وہ بھول آیا۔ کہاں کس جگہ۔ اُس نے ایک ہاتھ کی ہتھیلی دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر رگڑنی شروع کردی۔ آخر چُھری تیز کرنی پڑے گی۔ وہ دن بھر اس بیٹھک میں بیٹھا بیٹھا چھری تیز کرتا رہے گا۔ نلیما کی گردن پر آہستہ آہستہ نزاکت سی پھیرتے رہنے کے لئے۔ اُس کے ہاتھ کی ہتھیلیاں گرم ہونی شروع ہوگئیں۔

"کیا کر رہے ہو تم"۔

"کچھ نہیں! چُھری . . . . نہیں ذرا ہتھیلی میں چوٹ آگئی تھی یہ سوچ رہا تھا۔ اب تو ٹھیک ہے۔ کالج سے فرصت مل ہی گئی ہے۔ سوچ رہا ہوں اب کیا کروں . . . "

"پھر کبھی سوچ لینا۔ کھانا کب کھاؤ گے"

"جب تک نہیں کھاتا تب تک یہ صبح شام میں نہ تبدیل ہو جائے"

اس کی ماں چلی گئی۔ اُس نے ایک کے بعد ایک ریاضی کی کتاب کو میز کی نزدیکی سے دُور کاٹھ کے صندوق میں مقفل کردیا۔ فاؤنٹین پن میں سیاہی ڈال، کاغذ کے چار دستے جو اُس نے چند دن پہلے ریاضی کے مسئلے حل کرنے کیلئے خریدے تھے، باقاعدہ قرینے کے ساتھ میز پر رکھے۔ بس اُسے درکار ہی کیا ہے۔

کاغذ موجود۔

قلم۔ موجود۔

اور وہ لکھتا رہے گا، افسانے ۔ صبح سے شام تک ۔
اور انتظار کرے گا، کہ کتنی بار صبح اور شام کے درمیان وہ نیلما کے جذبات، اور خاموش محبت کی نازک گردن پر ہلکی چھری پھیرتا رہے ۔ پیشانی پر پسینے، خیالات کی زیادتی سے دماغ کی گہرائیوں سے اُمنڈ آنے والے پسینے ۔ اس نے ان کو پونچھنے کی کوشش کی، اور پھر وہ ایک شکست خوردہ انسان کی طرح اُٹھا ۔ شام نزدیک تھی اور وہ اپنی ماں کے پاس پژمردہ چہرہ بنا کر بیٹھ گیا ۔

"اب کیا کرے گا"۔

"کیا کروں گا ۔ لکھتا رہوں گا صبح سے شام تک"۔

صبح، شام میں تبدیل ہو گئی ۔ اور وہ ایک ہتھیلی کو دوسری ہتھیلی سے رگڑنے لگا ۔ گلی کی معصوم مُرغی کے کمزور گلے پر ہولے ہولے پھیرتے رہنے کے لئے ۔

"ساقی" دسمبر سنہ ۱۹۴۱ء

نیلوفر

نیلوفر تالاب میں کھلتے ہیں۔ جھیل میں پرورش پاتے ہیں۔ یا کہیں اور۔ یہ ہمیں معلوم نہیں۔ کبھی کبھی شہر کی گلیوں میں گھناؤنے ماحول میں بھی ایسے پھول کھلتے ہیں۔ تروتازہ، شگفتہ، شفاف، نازک اور انتہائی درجہ کے پاکیزہ۔ جو ہاتھ لگانے سے مرجھا جائیں۔ اور ان گلیوں کی رنگت کبھی کبھی ایسے پھولوں کی موجودگی سے نکھر جاتی ہے۔ پاکیزہ روشنی کا ایک ذرہ کبھی کبھی اندھیرے میں اتنی ضوفشانی کرتا ہے۔ کہ تاروں بھرا آسمان نیچے جھک کر اس روشنی کا مطالعہ کرلے۔

میلو کی ماں جب اسے پیٹنے پر آتی تھی اور اس کے گال کبھی سرخ اور

پھر کبھی کبھی ہلکے نیلے پڑ جاتے تھے۔ تو اُس کا بھائی کہتا تھا۔ بنا دیا نا نیلوفر اب کی بار شرارت کی تو ایک کی بجائے دو نیلوفر کے پھول کھلیں گے۔ سمجھی۔ میلو کتنی بھولی ہے۔ میلو! نیلوفر! نیلوفر!!" اور نیلوفر کے نام سے میلو کو بہت چڑ تھی۔ وہ منہ بنا کر ایک کونے میں بیٹھ جاتی۔ اس وقت اس کے نقش و نگار دلکشی کی غیر منتہی گہرائیوں میں کھو جاتے تھے اور وہ کوئلے کا ایک ٹکڑا اٹھا رسوئی کے فرش پر ٹیڑھے ترچھے نقوش کھینچنا شروع کر دیتی۔ چھوٹے موٹے ضرب تقسیم کے سوال۔ ہندوستان کا نقشہ یا پھر انگریزی کے سوال۔ ہندوستان کا نقشہ، یا پھر انگریزی کے چھوٹے چھوٹے لفظ سی۔ اے۔ ٹی کیٹ۔ معنی بلّی۔ آر۔ اے۔ ٹی ریٹ۔ معنی چوہا۔ بلّی اور چوہا۔ اُس کی ماں بلّی اور میلو ایک ننھا سا چوہا جو بلّی کی شرارے چھوڑنے والی آنکھوں کو دیکھ کر سہم جائے۔ کونے کونے میں دبکا دبکا پھرے۔ لیکن بلّی کی آنکھیں لال پیلی ہوتی رہیں۔ ایک روز اُس کی ماں نے پیٹنے کے تمام ریکارڈ مات کر دیئے۔ سوچے میلو گھر کا کام سنبھالے یا اسکول کا گھر کی اُستانی کہتی ہے برتن مانجھو۔ روٹی پکاؤ بچوں کو سنبھالو۔ مدرسے کی اُستانی کہتی ہے انگریزی سبق دیا کرو۔ کم از کم دس سوال نکال کر لاؤ ـــــــــ سب یاد کر کے لاؤ خوب پیٹے۔ گھر کی اُستانی کا کام نہیں کرتی تو بیلنوں اور چمٹوں سے خبر لے جاتی ہے اور مدرسے کا کام نہیں ہوتا تو رول سے، آخر ایک نازک ہستی کیا کیا کام کرے۔ میلو کی ماں پیٹے چلی گئی اور میلو چپ چاپ اُٹھی بستے کو کھولا۔ کتاب اور کاپی نکال اور سُرمہ کی پنسل خاموش قدم رکھتی وہ دالان میں آگے بڑھی۔ رسوئی سے دالان، دالان سے صحن اپنی غصیلی ماں کے نگاہ کے تاروں میں، اُلجھتی اُلجھاتی، اپنے آپ کو سنبھالتی کتاب

نیل اور کاہی ایک عظیم بوجھ جو ایسے کندھوں پر لاد اگیا ہو۔ جو اُسے نبھاہ نہ سکیں۔ نزاکت اور بوجھ سراسر بے انصافی۔ مگر کیا نزاکت پُر فضا وادیوں میں من ڈیڑھ من بوجھ کو نہیں نبھاتی۔ اور شائد وہاں نیلوفر کے پھول بھی کھلتے ہیں۔ لیکن وادی اُن کی حقدار نہیں۔ بدصورتی کے نہایت بے ڈھنگے ہاتھ سے اُن کو نہایت بیدردی سے توڑ لیا جاتا ہے۔ اور تپتی ہوئی چٹانوں پر سوکھنے کے لیے پھیلا دیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ رنگ وہ تروتازگی عنقا ہو جاتی ہے۔ اور نیلے آسمان کی رنگت جذب کئے ہوئے نیلوفر کے پھول دھوپ میں تڑپ تڑپ کر مر جاتے ہیں۔ میلو آگے بڑھی۔ اُس کے رُخسار طمانچے کھاتے کھاتے نیلے پڑ گئے تھے۔ نیلوفر ایسے۔ نیلوفر جو ایک ظالم ماں کی آتش فشاں بینائی میں تڑپ رہا ہو، سوکھتا جا رہا ہو، برابر، ہر لمحہ، ہر ثانیہ وقت کے بعید از قیاس ٹکڑوں میں اُس کی تروتازگی تڑپ تڑپ کر زندگی کے موڑ پر دم توڑ رہی ہو، معصومیت کی موت، بیسویں صدی کے فرشتے قتل گاہ میں، سکول و گھر دونوں زندگی کی تربیت گاہیں ہیں۔ سکول اخلاقیات جمالیات کی تعلیم دیتا ہے اور گھر خانہ داری کی مگر بیسویں صدی میں دونوں اپنے آپ کو اتنا اہم سمجھنے لگے ہیں۔ کہ ننھی نزاکت کے احساس کو سنبھالتی ہوئی معصوم بچیاں ایک کا نٹے کے بعد دوسرے میں اُلجھتی معلوم ہوتی ہیں۔ سکول کے تالاب میں کئی ماہی گیر ہوتے ہیں اور گھر کی ندی میں صرف ایک یا دو۔ ہر ایک ماہی گیر مچھلی کی ماہیت کا صحیح اندازہ لگانے کا منتظر ہوتا ہے۔ اور یہ تجربہ انسان کو مہنگا پڑتا ہی بیسویں صدی میں ہندوستان کی بساط پر جمی ہوئی تجربہ گاہیں، اور میلو وہ بھی اس تجربہ گاہ کا آلہ کار یا پھر بنا دی ندرہ بن چلی تھی۔ ماں ٹھوک بیٹھ کر اُس کو

ایک گرہستی کی صحیح تعلیم دینا چاہتی ہے اور مدرسہ وہ اسے صرف علمی مضامین پڑھا پڑھا کر برتری اور ترقی کی راہ دکھانا چاہتا ہے۔ اور ان دنوں کی پیداوار ایک نہایت عجیب ہستی بن جاتی جو اُس مقناطیس کی سوئی کے مانند ہے جس کو شمال کا کبھی صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ جو جدھر زیادہ کشش دیکھتی ہے اُسی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ سراسر غلطیوں سے بھری مقناطیس ہے جس نے بیسویں صدی میں شمال کا ٹھیک پتہ نہیں لگایا ہے کوشش میں تڑپتی ضرور ہے۔ لیکن کوئی سمجھے تو کچھ بات ہے اور یہ مقناطیسی سوئی سخت اضطراب کی حالت میں کبھی کبھی غلط رجحانات کی جھپٹ میں آکر ایسی ایسی سمتوں کی طرف راغب ہو جاتی ہے کہ موڑنا یا زبردستی صحیح شمال کی طرف دیکھنا ایک سعی لاحاصل بن کر رہ جاتا ہے۔

نیلو، مقناطیس کی سوئی، جس کو رسوئی میں صحیح شمال کو کیا کسی سمت کا ذرہ بھر خیال نہیں۔ رسوئی یا دالان میں پہونچتے پہونچتے شمال کے خیال میں ڈوب گئی۔ صحیح شمال، اُس رسوئی یا دالان میں یا عین اُس کی ماں کی جہنم کی آتش ناک پیٹیوں کی جانب، نہیں اُن غلط شمالوں کی اُلجھن سے آزاد ہو کر، زینہ کے ذریعے، زیریں صحن اور صحن کے سامنے متوسط درجہ کی بیٹھک میں۔ نیلو اُن زینوں سے آہستہ آہستہ اُتری اور نیلوفر کے پھول، اُس کے معصوم رخساروں پر کھلے ہوئے نیلوفر کے پھول تھوڑی تھوڑی تر و تازگی کھو چکے تھے وہ چپ چاپ صحن میں آگے بڑھی۔ آنسوؤں کی ہلکی ہلکی بوندیں، رخساروں پر رواں تھیں۔ اُس نے دھوتی کے آنچل سے ان کو صاف کیا اور بیٹھک میں گھس گئی۔

"نمستے"

"نمستے۔ ارے میلو روتی ہے پگلی۔ ماں جی نے پیٹا۔ وہ تو تیری بھلائی کے لئے سوچتی ہیں"۔

"اونہہ ہوں"۔ میلو نے رنجیدہ چہرہ بناتے ہوئے کہا۔

"پیٹنے کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے۔ بس پکڑا اور لگی پیٹنے۔ ہوں"۔

"میلو تو تو انگریزی اسکول میں پڑھتی ہے۔ بھلا اسکول میں پڑھنے والی لڑکیاں روتی ہیں"۔ سریش نے سنجیدگی سے سمجھایا۔

"اچھا نہیں روتی"۔ آنسوؤں کو پونچھا۔ "ہمارے سوال کر دو گے اب!"

"کیوں نہیں۔ تمہارا بھائی کہاں گیا ہوا ہے۔ وہ تو بہت شیخی بگھارتا ہے۔ کہیں یہ جانتا ہوں میں وہ جانتا ہوں۔ اُس سے پوچھ لیتی"۔

"بتانے ہیں تو بتائیے" اور اُس وقت نیلوفر کے پھول ایک عجیب انداز سے کھلتے ہوئے دکھائی پڑے۔ کتنے دلکش اور جاذب پھول۔ لیکن ماں کی بچا مار سے پیدا شدہ پھولوں سے مختلف۔ پاکیزہ، لطیف، رُوح پرور۔

"اچھا بھئی۔ تجھے تو بتانا ہی پڑے گا۔ اگر تجھے نہیں بتایا تو اتنی بڑی حویلی میں ہمیں کون رہنے دیگا۔ مالک مکان بھی نوٹس دے دیگا اور یہ بیٹھک خالی کرنی پڑے گی"۔

سوال، زندگی کے سوالوں سے کتنے مختلف۔ قطعی جُدا۔ ضرب، تقسیم، کسرِ اعشاریہ، منفی، تفریق، تجارت، وقت و کام وغیرہ وغیرہ۔ بالکل غیر ضروری چیزیں، دماغ کو سُوجھا دینے والے مرحلے۔ میلو برابر معصوم نگاہوں سے سریش

کے ہاتھوں اور ہاتھوں کے بعد کاغذ پر سوالات کے حل کو دیکھے جارہی تھی۔
اور ہاں میں ہاں ملائے جارہی تھی۔ سمجھ سمجھنے کی قطعی ضرورت نہیں۔ بالکل عین بعین وہی حل وہ رسوئی کی مدھم روشنی والی لالٹین کے سائے میں بیٹھ کر اپنی کاپی میں نقل کرلے گی اور اُستانی کے سامنے پیش کردے گی۔ اگر گھر کا اُستاد نارض ہو تو مدرسے کا مُدّرس راضی۔ اور اگر گھر میں سب کام چوکھا تو مدرسے میں غصہ کا مظاہرہ، بے جا فضول، کیا اُن ننھی معصوم بچیوں کے لئے دفتروں کی کرسیاں اسمبلیوں کی کوچیں خالی پڑی ہیں۔ نہیں! تو پھر کیوں ایسا وقوع میں آتا ہے۔ یہ دریافت کرنا پھر مقناطیسی سوئی سے ٹھیک شمال کا اندازہ لگا لینے کے مترادف ہے۔ شمال، اور ہر لحظہ تمہاری دماغی آنکھوں کی پتلیوں میں عکس ڈالتا ہوا شمال، اس کا صحیح اندازہ لگانا کتنا مشکل امر بن چلا ہے۔ ایک، دو، تین، چار...... پورے دس سوال۔ مقناطیس کی سوئی کو درست سمت کی طرف دھکیلنے کی کوشش، دباؤ، بوجھ...... سرلش چُپکے چُپکے کہے گیا اور میلو خاموشی کے ساتھ دیکھے گئی۔

"بس اور"

"نہیں۔ تھینک یو" میلو نے تمتماتے ہوئے رُخساروں کو سرلش کی طرف پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

"اوہ! میلو تو بالکل فرنگن بن گئی ہے فرنگن۔ خالص یورپین، تھینک یو۔ اوفوہ"۔

اور ننھی مادامویئسل Madamoiselle شرما گئیں۔

اور پھر وہی گل نیلوفر ہر لحظہ رنگت بدلنے والا نیلوفر۔ پنسل، کاپی اور کتاب۔ زادِ راہ۔ نہیں ہندوستانی لڑکی کی نجات۔ بیسویں صدی، میلو۔ کتابوں کے بوجھ نیچے دب جانے والی ہستی، نازک، لاغر۔

"جلدی پگلی۔ ماں جی پھر تو نہیں ماریں گی"۔

"جانے دو"۔

میلو کی زندگی کے تالاب میں نیلوفر کے پھول کھلے۔ باقاعدگی تو خیر نہیں تھی مگر کبھی کبھی ہفتہ دو ہفتہ، مہینے دو مہینے میں ضرور کھلتے۔ اور وہ رسوئی اور دالان سوکھی تپتی ہوئی چٹانیں بن بن گئیں۔ تمازتِ آفتاب اور غصہ کی گرمی سے لوہے کے کارخانے کی بھٹی کوئلہ کھا جانے والی بھٹیوں ایسی نارِ جہنم کو مات کرنے والی۔ ماں پیٹتی اور میلو ناچتی۔ رسوئی میں مقناطیس کی سوئی کی طرح ناچتی شمال کی تلاش میں اور ایک کے بعد ایک نیلوفر کے پھول کھلنے شروع ہو جاتے۔ جب اُن تپتی ہوئی چٹانوں پر یہ پھول اضطراب کی آغوش میں لاانتہا بے قراریوں کا شکار بن چکتے تو پھر زینہ، زینہ کے بعد صحن اور صحن کے بعد بیٹھک کے خاموش برف ایسے ٹھنڈے ماحول میں پناہ لیتے۔ لرزتے، کانپتے ڈرتے، ڈراتے اِدھر اُدھر دیکھتے، جنوب، مشرق، مغرب اور شمال وہ اتنا موہوم کیوں ہے۔ کیا جغرافیہ کی کتابوں میں اس کا ذکر تک بھی نہیں کیا جاتا۔ بیٹھک میں مقناطیس کی سوئی کو کسی حد تک شمال کا اندازہ تو لگ جاتا مگر درست شمال، قطب شمالی کے برفستانی علاقوں کو چومتا ہوا شمال غائب، قصۂ ماضی۔ دار الفنا کا باشندہ، موت کی آغوش اور ناقدری کے پاؤں تلے کچلا جانے کے بعد تڑپتا

ہوا اشمال۔

سریش دیکھتا تھا کہ میلو حتی الوسع گھر اور مدرسہ کا کام نپٹانے کی کوشش کرتی ہے۔ مگر یکجہتی اور تکمیل، کہاں ملتی ہیں۔ وادیوں میں خاموش چشموں سے دہکتے ہوئے سینوں میں رشفق کے جھلمل نقاب میں، آخر کہاں۔ یا پھر ماں کی غصیلی آنکھوں کے سائے میں۔ کہیں نہیں۔ یہ سوال صدیوں پرانا ہے، روز ازل کا تخیل صناع قدرت کی اُمید، مگر تکمیل اب بھی ایک غیر حل شدہ مرحلہ ہے۔ بیسویں صدی کہتی ہے ہم نے تکمیل کو پالیا کیسے، کس طرح۔ جنگی مشینوں کی گھر گھراہٹ میں، یا مدہم روشنی کی لالٹین کے سایوں میں شاندار عمارتیں، گھاس پھوس کی جھونپڑیاں، دریا، پہاڑ جنگی تکمیل، انسانیت کا تشنۂ تعبیر خواب۔ ایک جستجو جو ماضی سے حال اور حال سے مستقبل میں گم ہوئی نظر آتی ہے۔

میلو جوں جوں زندگی کی منازل طے کرنے لگی۔ توں توں سریش کے پاس اُس کا آنا کم ہوتا گیا۔

ایک روز۔ ۔ ۔ ۔

میلو، سریش کے پاس آئی۔ اُس کی ماں کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔ سریش اپنی بیٹھک میں بیٹھا ہوا تھا۔

"میلو" زندگی کے پندرہ سال بتا دینے والی میلو۔ بیٹھک میں کھڑی ہوئی تھی۔ "آؤ بیٹھو"۔

میلو نے ایک خط اپنے ہاتھ سے سریش کی میز پر رکھدیا۔ دیکھیے گا۔ ذرا اس کا مطالعہ کر لیجیے۔ ۔ ۔ ۔ اور وہ واپس جاتی ہوئی معلوم ہوئی۔

"ذرا ٹھہرو۔ آخر میں اس کا خط کا کیا کروں"۔

"پڑھ لیجیے گا"۔ اور میلو آزردہ، پریشان، جھکی جھکی نگاہیں کئے۔ پھر اپنے دالان میں جا کر بیٹھ گئی۔

خط، بیسویں صدی کی محبت کا ایک نادر نمونہ۔ کسی شوقین مزاج نے میلو کو لکھا تھا کہ وہ اس پر شیدا ہے۔ ہزار دل و جان سے اور مقصد صرف نفس ہیمہ کی تسکین جیسی تسکین۔ عجب۔ گویا۔ گویا محبت اتنی ڈھل چکی ہے۔ میلو ایسی لڑکیاں سکول میں پڑھ کر یونہی نکھرتی ہیں۔ کہ اُن کو خواہشات کا شکار بنایا جائے . . . . میلو نے اپنی آزادی کا صحیح استعمال کیا کہ سریش کے پاس وہ خط پہونچایا۔ وہ سمجھتی تھی کہ سریش عقلمند انسان ہے۔ سریش عجیب شش و پنج میں تھا کہ کیا کرے۔ میلو کو اُس نے سینکڑوں سوالات کے حل کرکے دئے ہیں۔ وہ میلو کا اُستاد ہے۔ کیونکہ میلو نے اُس کی عزت اور احترام کا خیال رکھا اور آج میلو نے پھر اُس کو ایک عجیب سوال حل کرنے کے لئے دے دیا۔ کتنا مشکل اور اہم مرحلہ۔ کیا بزرگ انسان اس کو حل کر سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ اُن میں اتنی فراخ دلی کہاں۔ اُنہوں نے ابھی ٹھیک مثال کا اندازہ کہاں لگایا ہے۔ اور اُن کے بچے اُن کی طرف امداد مانگنے کے لئے دیکھتے ہیں۔ مگر نہیں ملتی۔ آخر وہ کیا کرے۔ خط اُس کے سامنے میز پر پڑا تھا۔ میلو کی ہمت کا کرشمہ اور انسانی خباثت کا نمونہ . . . . .

میلو تیسرے روز پھر آئی۔ سریش کی طرف حیرت سے دیکھنے لگی۔

"میلو۔ بیٹھ جاؤ، میں نے وہ خط دیکھا ہے میلو تم سکول میں کب

تک پڑھ گی"۔

"یہ آخری سال ہے پھر....."

"پھر کیا ہو گا؟"

"کچھ نہیں۔ ماتا جی کہتی تھیں۔ کہ میلو کو اس سال کے بعد سکول سے اُٹھا لیں گے"۔

"اچھا! پھر آپ کا کیا خیال ہے اُس خط کے بارے میں..."

"آپ ہی سوچ لیجئے۔ میرے لئے آپ ہی سب کچھ ہیں۔ گھر میں کون سوچ سکے گا......" آنسو، شرافت کے قطرے۔ کیا یہ ہر ہندوستانی لڑکی کی آنکھوں میں نہیں آتے۔ ایسے وقت، ان لمحات میں، اور یہ مقناطیسی سُوئی کی صحیح مثال کے اندازہ لگانے کی بے قراری ہے۔ تڑپ ہے اضطراب ہے۔ میلو کے رُخساروں کے پھُول مرجھا سے گئے اور وہ پھر واپس چلی گئی۔ ماں کی نگاہوں کے تاروں میں اُلجھی اُلجھی پھرنے کے لئے۔ تپتی ہوئی چٹانوں پر سکون کی تلاش، فضول جستجو میں غرقاب ہو جانے کے لئے میلو ایک ایسا پرندہ بلکہ ننھی چڑیا جو عقاب کی نظر میں آچلی ہو۔ اور جسے جھپٹنے کے لئے عقاب بیقرار ہو۔ اور سریش جس کے ذمّہ اُس عقاب سے چھٹکارا دلانے کا کام سپرد کر دیا گیا ہو سریش کیا کرے؟"

پھر آئی —— میلو سریش سے دریافت کرنے پھر آئی۔

"سوچا آپ نے"۔

"سوچ رہا ہُوں۔ بہت شدت کے ساتھ میلو۔ مگر میں دیکھتا ہوں میرے

ہاتھ کٹ گئے ہیں۔ اور میری زبان وہ —— کچھ نہیں۔ میں کیا کروں کیا کہوں، کیا کہوں۔ اچھا تم جاؤ۔ مجھے سوچ لینے دو۔" میلو پھر چلی گئی۔

مکان کے ملحق ایک باغیچہ تھا۔ اور چھوٹا سا مندر، عورتیں صبح و شام اِدھر جاتی پُوجا درشن کر کے واپس آجاتیں۔ میلو بھی اکثر اُدھر جایا کرتی۔ اکثر اپنی ماں کے ساتھ اور کبھی کبھی اکیلی۔ اُدھر آدمی کا گذر بہت کم تھا۔ سریش کبھی کبھی اپنے کام سے فراغت پا اُدھر الگ جا بیٹھتا تاکہ اُس کا دماغ تر و تازہ ہو جائے۔ وہ کالج کا ذہین طالب علم تھا۔ ذہین، عقلمند اور کچھ آزاد خیال۔ ایک روز وہ شام گئے وہاں جا پہنچا۔ بیٹھا رہا، سوچتا رہا آخر میلو کو کیا رائے دے۔ اپنے شاگرد کو کس طرح ٹھیک راستے پر لگائے اُس کے ہاتھ میں صحیح شمال موجود تھا۔ وہ شمال جسے میلو کی مقناطیس چاہتی تھی۔ قطب شمالی کی برفستانی چوٹیوں کو چومتا ہوا شمال۔ اور اُس تڑپتی ہوئی مقناطیس کو صحیح شمال دکھا سکتا تھا۔ اور نیلوفر کے پھولوں کو تپتی ہوئی چٹانوں پر سوکھنے سے بچا سکتا تھا۔ . . . .

سریش کو بیٹھے بیٹھے بہت دیر ہو چلی۔ نیلے آسمان کو تختۂ سیاہ بنا کر خیالاتی چاک سے سوال حل کرنے کے لئے آکر بیٹھا تھا۔ لیکن شام کے اندھیرے میں اُسے اُس تختۂ سیاہ پر لکھا سب مِٹا مِٹا سا دکھائی پڑا۔ شفق کے ڈسٹر نے اُس کو ایک سرے سے مٹا دیا۔ اور سریش کی ساری محنت اندھیرے میں ڈوبتی نظر پڑی، مٹے مٹے نقوش، دھندلے خیال، پریشانی اور اضطراب؛ ایک سوال کنندہ کی ناکامیابی۔ اُس نے کوشش تو بہت کی کہ شفق کے ہاتھ سے اُس خونین ڈسٹر کو چھین لے عجب! نیلے آسمان پر شفق اپنا ڈسٹر پھیرتی ہے۔ تو نیلا آسمان کیوں سیاہ ہے؟

جاتا ہے - اور جب میلو کی ماں اُسے خوب پیٹتی ہے تو اُس کے رُخسار کیوں نیلے
کے بجائے سُرخ نہیں ہوتے - نیلوفر، آسمان کی غیر منتہی جھیل میں کھلنے والے نیلوفر
میلو کا سایہ اُس جھیل میں پڑتا ہے - لرزتا، تڑپتا ہوا سایہ - میلو . . . . .

" میلو - ارے تم یہاں اتنی دیر گئے "

" ہاں! کچھ سوچا - بتائیے نا - سوال کا جواب دیجئے آپ نے اتنے سارے
سوال حل کر ڈالے " میلو نے مایوسانہ انداز میں جواب دیا -

" سوچ رہا ہوں - یہاں آیا کس واسطے تھا - سوال حل کرنے کے لئے تمہارا
سوال حل کرنے کے لئے - بہت اہم سوال ہے - بہت وقت سے حل ہو سکیگا "

" اتنا آسان سوال . . . . " میلو نے گھاس کے نازک تنکوں کو پودوں سے
جُدا کرتے ہوئے کہا -

" آسان سوال - تم جاؤ میلو - مجھے اس سوال کا جواب سوچ لینے دو -
جاؤ دیر ہو رہی ہے - ماتا جی انتظار کر رہی ہوں گی " سرلش نے نصیحت آمیزانہ انداز
میں میلو سے درخواست کی -

" چلی جاؤں گی - تو آپ اس سوال کو حل نہ کر سکے " اور میلو اندھیرے کی طرف
دیکھنے لگی - جو جلد ہی اُس مندر اور باغیچے کو اپنی لپیٹ میں لینے والا تھا - آسمان
کے سُرخ اور نیلے رنگ کے ملاپ سے پیدا شُدہ اندھیرا - سُرلش بھی غیر ارادی
طور سے میلو کی نگاہوں کی پیروی کرنے لگا -

" اچھا نمستے "

" نمستے "

"ارے ارے ...... (میری آواز میں) میلو۔ میلو ٹھہرو۔ میں تم کو سوال کا حل بتا دوں گا۔"

سرِیش کے قدموں میں گلابی تھے۔ دو پھول بڑے ہوئے تھے۔ میلو کے سوال کا حل۔ لیکن میلو نے گلاب کے نیلے پھول کہاں سے پائے نیلوفر بھی تو نیلا گلاب ہی۔ نیلے آسمان کی جھیل میں نیلوفر کے پھول کھلتے ہیں۔ اور میلو کا سایہ اُس میں پڑتا ہے۔ وہ اُس کی چوٹی کو کھینچ کر گھسیٹ لائے گا نیلوفر کے پودوں کی ہمسائگی سے کھینچ لائے گا۔ اور گھسیٹے جائیگا۔ حتیٰ کہ ذات کی دیوی اُن دونوں کو اپنے آنچل میں پناہ نہیں دیتی۔ میلو میلو ...... اور سرِیش نے اُس باغیچہ میں اپنے پاؤں تلے بہتے والے تالاب میں نیلوفر کھلتا ہوا دیکھا۔ ہنستا ہوا۔ مسکراتا ہوا نیلوفر۔ تالاب جس کی وسعتیں آسمان کی جھیل سے بھی زیادہ، اور لاانتہا نیلوفر کے پھول۔ وہ اُن کو ایک کے بعد ایک توڑے جائیگا اور کہے گا "میلو یہ نیلوفر کے پھول۔ تم تو نیلا گلاب ہی لائی تھیں میں نیلوفر کے پھول لے آیا۔ ان کو سنبھالو اپنی نازک آغوش میں سنبھالو۔ یہ ہی تمہارے سوال کا حل ہے۔ میلو۔ میں نے اسے حل کر لیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس سے پیشتر کہ شفق اپنے ڈسٹر سے آسمان تختہ سیاہ کو صاف کرے میں اسے حل کر چکا تھا۔ ایسے نہیں صدیوں پہلے۔ اور اپنی بیٹھک میں کئی مرتبہ میں نے اس کو حل کیا ہے میلو۔ میلو میں تمہاری چوٹی کو گھسیٹتا ہوا لے جاؤں گا۔ حتیٰ کہ رات کی دیوی ہم کو اپنے آنچل میں پناہ دے میلو ...... " سرِیش کے پاؤں تلے سوکھا ہوا تالاب عرصہ ہوا سوکھے ہوئے نیلوفر اندھیرا ...... وہ کچھ جھومتا سا اُٹھا۔ ناچتا سا چلا۔ آخر اُس نے سوال حل

کر ہی لیا۔ کتنا مشکل سوال اور کتنا آسان حل، کالج میں دن رات ریاضی کے
مرتے پیچیدہ سوال اور دماغ تھکا دینے والی باتیں۔ لیکن اصلی سوال تو اُسے
میلو۔ نے حل کرنے کے لئے دیا اور وہ چٹکیوں میں حل ہو بھی گیا۔

. . . .

"اتنی اتنی دیر میں آتی ہے باہر سے ایں!" اور میلو کے نازک رُخساروں پر
تڑ سے طمانچہ پڑا۔

ایک!

دو !!

تین !!!

اور نیلوفر کھلنے شروع ہو گئے۔

"ہاں میرے نیلے گلاب کے پھول"۔ میلو کے بھائی نے کہا۔

"اس جگہ رکھے تھے۔ نامعلوم کہاں گئے۔ کون لے گیا کمبخت...!"

"میلو تو تو نہیں لے گئی؟"

"نہیں ماتا جی۔ میں نہیں لے گئی ماتا جی"۔ میلو کانپنے لگی۔

"پھر جھوٹ بولا۔ بتا وہ نیلے گلاب کے پھول"۔

اُس روز میلو کو خوب پیٹا گیا۔ وہ سُبک سُبک کر رونے لگی۔ نیلے
گلاب کے سریش کی جیب میں رکھے ہوئے تھے۔ وہ چُپ چاپ دیکھتا رہا
تھا۔ اور پھر اُسے کچھ ایسا دکھائی دیا۔ کہ میلو کے سُرخ رُخساروں پر نیلا رنگ
ہلکے گیروے رنگ میں تبدیل ہو چلا۔ اُن کی نگاہوں کے سامنے...نہیں!

بلکہ اُسے بچّوں کی چیاؤں میاؤں سُنائی دی۔ بڑھی ہوئی ڈاڑھی اُس بیٹھک
میں نظر آئی . . . . . . اور میلو اُس کا سایہ آسمان کی جھیل میں پڑتا ہے۔
جہاں نیلوفر کے پھُول کھُلتے ہیں۔ وہ اُس کی چوٹی گھسیٹ کر کبھی وہاں سے
کھینچ کر لا نہیں سکتا۔ حتیٰ کہ رات کی دیوی اُن کو اپنے آنچل میں پناہ دے۔

سریش کی مقناطیس کا صحیح شمال میلو۔ مگر شمال آجکل کے زمانے میں
کہیں ملتا ہے۔ اور مقناطیسی سُوئی تڑپتی رہے گی۔ اضطراب و بیقراری کی بے پناہ
وسعتوں کو کھوجے گی۔ سچّے شمال کی جستجو میں، شمال، قطب، منجمد شمالی کے برفستانی
علاقے میں گُم ہو جانے والی سمت۔

"ادبِ لطیف" دسمبر سنہ ۱۹۴۱ء

مانجھی

دریا کی روانی میں مستی پوشیدہ ہے۔ مانجھی چپو آہستہ آہستہ چلا رہا ہے۔ کشتی جھکولے کھا رہی ہے۔ ہوا زناٹے سے چل رہی ہے۔ لہروں سے ٹکر لیتی ہوئی۔ ہوا جس کی آواز سانپ کی پھنکار سے مشابہت رکھتی ہے۔ کنارے کے درخت لرزہ براندام۔ نرسل کے پودے ہوا کی شدت سے لچک لچک جاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی اٹھلاتی لہروں کے عارض کو چوم لیتے ہیں۔ مگر لہریں غصہ کھا کر ان کو پھر اوپر اچھال دیتی ہیں۔ لیکن نرسل کے پودے پھر بھی بے قرار ہیں۔ لہروں سے ملنے کے لئے......

مانجھی خاموش ہے ۔ خیالات کی دنیا میں مستغرق ۔ اس کے ہونٹوں پر ایک بھولا ہوا گیت بار بار آ کر واپس ہو جاتا ہے ۔ نامعلوم کونسا گیت ۔ شاید وہ لہروں کی کشمکش ہوا کی تیزی، کشتی کی لرزش میں تو پوشیدہ نہیں ۔ ہاں اسے یاد آ گیا ۔ ایک ایسی ہی رات جب وہ کشتی کو کنارے پر لگا چکا تھا ۔ اور پاس ہی کھڑے تناور درخت سے کشتی کا رسّہ باندھ کر گھر کا رُخ کر رہا تھا تو وہ بھولا ہوا نغمہ اس کے ہونٹوں پر تھا ۔ اور پھر اس نے دیکھا ۔ ایک شرمیلی دوشیزہ، مجسّم بھولا پن، اس کے سامنے کھڑی ہے ۔ اور اس کی آنکھیں غیر ارادی طور پر اس بھولی بھالی لڑکی کو گھورنے لگی تھیں ۔

" مانجھی " اور مانجھی نے تعجبانہ انداز میں لڑکی کی طرف دیکھا ۔

" دریا پار جانا ہے ۔ لے چلو گے " اور مانجھی کو محسوس ہوا کہ لڑکی کو بہت ضروری کام ہے ۔ جو اتنی رات بیتے تن تنہا ہوا کے تھپیڑوں کو سہتے ہوئے، خوفناک طوفان سے کھیلتی دریا کے کنارے آن پہنچی ۔ لیکن جب اس نے دیکھا ۔ اپنے مضبوط ہاتھوں سڈول ٹانگوں ۔ اور بھرے ہوئے چہرے کو ۔ تو اس کا شباب جاگ اٹھا ۔ پھر اسے خیال آیا وہ نوجوان آدمی، ہے شباب کا جیتا جاگتا مجسمہ، رات اور تن تنہا لڑکی، اور ایک نوجوان ۔ اور اس کے سارے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی ۔ نامعلوم اس کا معصوم دل حُسن کی رنگینی میں کھو کر کسی عظیم گناہ کا مرتکب نہ ہو جائے ۔ نیکی اور محنت کی کمائی اور ساری ریاضت خاک میں نہ مل جائے ۔ اور وہ سوچنے لگا وہ کشتی لے چلے یا نہیں ۔

" مانجھی کیا سوچ رہے ہو ۔ جلدی فیصلہ کر لو ۔ ضروری کام ہے " اور اس کے لفظ لفظ میں التجا تھی ۔

"اچھا چلو" مانجھی نے کشتی کے رسّے کو کھولا۔ اور لڑکی کشتی میں سوار ہوگئی مانجھی کشتی کھینے لگا۔

یکایک ہوا نے خاموشی اختیار کی۔ دھندلاپن چاندنی میں منتقل ہوگیا۔ اور ماہ عالمتاب فلک کی بلندی پر نمودار ہوا۔ لہریں جو پہلے غصہ میں ناگن کی طرح بل کھا رہی تھیں۔ مخمور شرابی کی طرح ناچنے لگیں۔ نرسلوں کے قدموں کو چھوتی ہوئی کنارے کے سنگریزوں سے ٹکراتی ہوئی۔ ایک منظم نغمہ بیدار کرتی دریا کی روانی کے ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔ پانی نے لہروں سے کھیلنا شروع کردیا۔ طوفان اور تاریکی ایک دم پُرامن ماحول میں تبدیل ہوگئے۔ مانجھی کی آنکھوں میں شباب ناچنے لگا۔ لہریں اسے دعوت کیف دے رہی تھیں۔ اور تارے وہ شاید اسے دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ کہ وہ خاموش کیوں ہے۔ شباب، حُسن، لہریں، چاندنی اور مانجھی کو ایسا محسوس ہوا۔ گویا قدرت آج رقصاں ہے۔ دریا پار جھومتے ہوئے درخت، لچکتی ہوئی نازک ٹہنیاں۔ کشتی کے ایک کونہ میں ایک دوشیزہ کچھ سمٹی سمٹائی بیٹھی ہوئی۔ اور مانجھی غیر ارادی طور پر گانے لگا۔ "او کشتی والے۔ چلا جلدی چلا۔ ساجن کھڑا کنارے۔ ساجن کھڑا کنارے ...... اور سیدھی سادھی اوڑھنی پہنے لڑکی مانجھی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگی۔ شاید وہ اس سے کچھ سوال کرنا چاہتی تھی۔ شاید وہ اس سے کچھ پوچھنا چاہتی تھی" کچھ یوں ہی۔

پھر مانجھی نے لڑکی سے پوچھا "۔ ایسا کیا کام ہے ضروری"۔ "ہے" اور مانجھی کو محسوس ہوا کہ لڑکی نے سرد آہ کھینچی اس کی پیشانی پر ندامت کے آنسو نمودار ہوگئے۔ اور وہ اپنے آپ کو لعنت ملامت کرنے لگا۔

"اتنی رات گئے کیا کام پڑ گیا"۔

"ایسا ہی کام پڑ گیا۔ ذرا جلدی پہنچا دو تو اچھا ہو گا۔

"پھر بھی" اور مانجھی نے چپوؤں کو تیزی سے چلانا شروع کر دیا۔ کشتی آرام سے لہروں کو چیرتی تیز سے تیز تر ہو گئی۔

"بتا دو نہ بہن تمہیں بہت تشویش ہو رہی ہے شاید"۔

"وہ بیمار ہیں۔ دریا پار گاؤں میں۔ شام کو خبر ملی اور میں بھاگوں بھاگ دریا پر چلی آئی"۔ اور دوشیزہ کی آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے۔

"صبر کرو بہن جلد اچھے ہو جائیں گے" اور کشتی پانی میں اڑی جا رہی تھی۔ مانجھی کے ہاتھ میں تیزی تھی۔ اسے جلد از جلد دوسرے کنارے جا لگنا ہے۔ اس لڑکی کا خاوند بیمار ہے۔ خدا نہ کرے اس سے پہلے کہ وہ لڑکی وہاں پہنچے وہ دارِ فانی سے رخصت نہ ہو جائے۔

مانجھی نے چپو چھوڑتے ہوئے کہا "لو اترو آ گیا کنارہ"۔

"اچھا" اور لڑکی کشتی سے اتر گئی۔ سنسان جنگل، ڈھلتا ہوا چاند، شاید چند منٹوں کا مہمان، اور وہ شاید کھڑی سوچ رہی تھی۔ وہ تن تنہا ان میلوں کو کیسے طے کر سکے گی۔ وہ سہمی ہوئی دکھائی معلوم پڑتی تھی۔

"مانجھی لو اپنا کرایہ"

"مگر تم اکیلی کیسے جا سکو گی۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں بہن"۔ وہ دوڑا دوڑا موم بتی اور دیا سلائی کا بکس جو اس نے کشتی کے ایک کونے میں رکھ چھوڑا تھا لے آیا۔

"چلو"

"تم تکلیف نہ کرو میں چلی جاؤں گی"۔

مانجھی نے کشتی کو کنارے سے باندھ دیا اور دونوں گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔

پھونس کی جھونپڑی۔ دیا ٹمٹما رہا تھا۔ جس کی مدہم روشنی میں ایک انسان، شدت مرض سے کراہ رہا تھا۔ شدت کی کھانسی اور گڑگڑاہٹ، اور لڑکی مریض کے سہارے جا کر بیٹھ گئی۔ مریض نے اس کی طرف دیکھا اور خاموش ہو رہا۔ مریض کے چہرے سے اطمینان کے آثار نمایاں ہو گئے۔

مانجھی دروازے پر خاموش کھڑا تھا ادھ جلی موم بتی اس کے ہاتھ میں تھی۔

"آؤ بھیا، بیٹھ جاؤ۔ تم تھک گئے ہو"۔		"یہ کون ہے رادھا"

"مانجھی۔ میں اسی کشتی میں تو سوار ہو کر آئی ہوں اور یہ ہی مجھے اتنی دور چھوڑنے آیا ہے"۔

"بیٹھ جاؤ بھیا"، مریض نے مری آواز میں کہا۔

رادھا نے مانجھی کو دودھ پلایا۔ اور مانجھی چٹائی پر سو رہا۔ حتیٰ کہ سورج کی کرنوں نے گاؤں کے کھیتوں میں کندن بکھیرنا شروع کر دیا۔ اور مانجھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

"چلا، بھیا"۔		"ہاں بہن تمہارے سوامی اب کیسے ہیں"۔

"ٹھیک ہیں۔ پھر کبھی آؤ گے نا" اور رادھا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "ہاں"

وہ رادھا سے رخصت ہو کر دریا کی طرف چل دیا۔ اس نے گھوم کر دیکھا رادھا دروازے پر کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی تھی ...... اور آج وہ رادھا کے گاؤں کے نزدیک ہی طوفان میں گھر چکا ہے۔ اُسے اُمید ہے کہ اس کی بہن اُسے پناہ دیگی۔

سڑک

تھکا پیاسا۔ سوکھے ہونٹ، مرجھایا چہرہ۔ وہ چلتے چلتے ہار سا گیا۔ اُسکی دونوں پنڈلیاں درد کے مارے اکڑی جا رہی تھیں، وہ شیشم کے سایہ میں تھوڑی دیر کے لئے رُکا۔ زمین سے اُٹھی ہوئی جڑ پر بیٹھ گیا۔ ستّنے کو گھٹنوں تک سرکایا اور دونوں ہاتھ سے پنڈلیوں کو دابنے لگا۔ ملا۔ سہرایا لیکن درد ہر لمحہ، ہر ساعت فزوں ہونے لگا۔ آٹھ دس میل صرف، آج وہ اتنا ہی فاصلہ طے کر پایا۔ اور اس کی پنڈلیاں جواب دیتی معلوم ہوتی تھیں جب پنڈلیوں کو دابنے، مسلنے اور ملنے سے کچھ درد کی شدت میں کمی نہ ہوئی تو اُسے بہت غصہ آیا، وہ مٹھی بنا کر

بے تحاشہ اُن تھکی ہوئی پنڈلیوں پر مارنے لگا - ایک، دو، تین نہ معلوم کتنی، لیکن
پھر بھی پنڈلیاں تھکاوٹ کا احساس سنبھالے معلوم ہوتی تھیں۔ سڑک کے
دونوں طرف کچّی پٹری تھی - پیلی پیلی ریت - اور کہیں کہیں کالی کالی مٹّی کے ٹینس
کے گیند کے برابر ڈھیلے، ہوا چلتی اور باریک ریت اُڑنے لگتی، بار بار مسافر نے
اُن ریت کے باریک ذرّات کو حملہ آور دیکھ کر اپنی آنکھ کو ڈھانپ لیا اور
وہ ذرّات اُس کی نیلی دھاری والی قمیص سے چمٹ چمٹ کر رہ جاتے" یا کھلی
ہوئی پنڈلیوں کا درد، سڑک کی ویرانی اور تھکن سے مجبور ہو کر اُس نے اپنی
مختصر سی پوٹلی کو کھولا - اور گاڑھے کی چادر بچھا کر لیٹ رہا - اُسے اُمید تھی کہ
شاید نیند کی آغوش میں تھکن اور پنڈلیوں کا درد کافور ہو جائیں گے - نیند اُس نے
کئی دفعہ سونے کی کوشش کی ہے مگر نہ سو سکا سڑک کے کنارے، شیشم کے
سایوں میں لطیف ہوا چلتی ہے، امن اور آشتی کی سلطنت ہے، بار بار سونے
کا ارادہ کر کے لیٹتا تھا مگر نہ سو سکا، اور آج پھر وہ اُسی تجربہ کو دُہرا رہا تھا - آنکھ جھپکی
بند ہوئی - لطافت، پاکیزگی، خواب اور میٹھے میٹھے خیالات، تمنّائیں، آشائیں اور
زندگی کا غیر مرئی احساس بالکل لطیف احساس اور اُسے اُمید ہوئی کہ وہ ضرور سو
سکے گا - آنکھ بند کئے لیٹا رہا - اُس نے کچھ قدموں کی چاپ سُنی، لیکن وہ ایک دم
سُنائی دینی بند ہو گئی، بالکل ناممکن بات - راہگیر اتنی جلدی سڑک سے غائب تو
نہ ہو جائیں گے - سونے کے لئے لیٹا تھا، پھر آنکھ ملتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا سایہ
میں دو آدمی اور میٹھے سستا رہے تھے -

"کہاں جا رہے ہو بھائی"

"کہیں نہیں۔ ذرا سستانے کے لئے بیٹھ گئے۔ تم سوتے سوتے کیوں اُٹھ بیٹھے۔ نیند نہیں آتی"۔

"یوں ہی۔ مجھے دن میں بالکل نیند نہیں آتی۔ کوشش البتہ ضرور کرلیتا ہوں

آس پاس میں کوئی سرائے ہو تو بتاؤ۔ دس بارہ میل کا سفر اور طے کرنا تھا۔۔۔۔

آٹھ دس میل پرے لاری مجھے چھوڑ گئی تھی۔ اس سڑک پر لاریاں نہیں چلتیں۔ اس لئے سوچا چلو پیدل ہی چلا چلوں۔ بیس میل کا سفر"

"اِکّا یا بیل گاڑی ہی کرایہ پر لے لیتے"۔

"لے تو لیتا۔ مگر میں آج پیدل سفر کرنے کے ارادہ سے چلا تھا۔ بیس میل طے کرنے میں مشکل سے پانچ گھنٹے لگتے ہیں لیکن اب پاؤں جواب دیتے معلوم ہوتے ہیں۔ بچپن میں تو خیر نہیں لیکن سکول کے زمانہ میں اپنے گاؤں سے روز چھ میل پرے پڑھنے جایا کرتا تھا اور واپس آتا تھا۔ پندرہ بیس میل کا سفر معمولی بات تھی ـــ"

نو واردوں نے تھوڑی دیر مسافر کی طرف دیکھا۔ ایک نے سر کھجایا دوسرے نے لُٹیا ڈور کی طرف دیکھا پھر اُن میں سے ایک بولا:۔

"اس سڑک کے کنارے کنارے چلے جاؤ۔ ڈیڑھ کوس نہیں ایک کوس پرے ایک ٹوٹی پھوٹی سرائے ہے۔ بہت پُرانی سرائے ہے۔ اُس میں چلے جاؤ بھیّا"۔

"اچھا" مسافر کپڑے جھاڑتا ہوا اُٹھا۔ اپنی پوٹلی کو سنبھالا۔ اور چلنا شروع کردیا۔ اُس کی پنڈلیاں شاید بغاوت کرتے کرتے تنگ آچکی تھیں۔ لہٰذا مسافر

اپنے آپ کو بہت ہلکا سا سمجھنے لگا۔ بالکل ہلکا۔ وہ تھکن سب کافور ہو چلی تھی۔ سرائے میں قیام کرنے کے بعد رہی سہی تھکن بھی اتر جائے گی۔ سرائے والا لیگا ہی کیا۔ ایک دوئنی کھانے کی اور ایک اکنی چارپائی کا کرایہ اور ساری رات آرام سے کٹ جائے گی اور صبح وہ پھر اپنے سفر کی تیاری میں مشغول ہو جائیگا۔ اس کے سامنے سڑک، پختہ سڑک کا ایک کوس لمبا فاصلہ تھا۔ اسے اُمید تھی کہ وہ پنڈلیاں اتنے سفر کو طے کر سکیں گی۔ دن ڈھلنا شروع ہو گیا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف جوار باجرے کے کھیت تھے۔ جن کے اندر پکی ہوئی سٹھیاں تھیں۔ باجرے کی چھ چھ انچ لمبی پکی ہوئی بالیاں اور پودے، دن ڈھلتے وقت چلنے والی مخمور ہوا میں جھکولے کھا رہے تھے اور ذرا شدت کے جھونکے کے چلنے سے لچک سے جاتے تھے۔ بالکل کسی نازک بدن دوشیزہ کی لاغر کمر کی طرح۔ سائے بتدریج لمبے ہوتے جا رہے تھے اور دور زمین پر چھایا ہوا آسمان رنگ تبدیل کر رہا تھا۔ کچھ ہلکا سرخ یا پھر ارغوانی یا پھر ایسا رنگ جو پیازی اور نیلے رنگ کی آمیزش سے بن جایا کرتا ہے، اُس کی خواہش ہوئی وہ آنے والی شفق کے سایہ میں پناہ لے کم از کم وہاں یہ سڑک، یہ پیلی ریت، اور ریاضت، زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے مشقت کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ اور اسی ریاضت کے پیچھے اُس کو یہ بیس میل سفر طے کرنا تھا۔ اُسے سڑک کے بیچوں بیچ چلنے میں یک گونہ مسرت محسوس ہوئی، کیونکہ سڑک کے بیچ میں سے وہ آنے والی شفق کی دلہن کے استقبال کی تیاریاں بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ بڑی بڑی درختوں کی آگے جھکی ہوئی ٹہنیاں اس کی حدِ نظر کو کاٹتی معلوم پڑتی تھیں۔ لہذا وہ سڑک کے سہارے

سہارے جھومتے ہوئے کھیتوں، شام کو بسیرا کرنے کے لئے اپنے اپنے گھونسلوں کو واپس ہوتے والے پرندوں کی موسیقی، اور شفق کے انتظار میں گم ہو کر جھومتا سا مخمور قدم رکھنے لگا۔ کتنے آسان قدم، وہ زندگی بھر اس طرح سڑک کے بیچوں بیچ چلے جائے گا۔ بے خوف وخطر۔ کتنی سیدھی صاف، شفاف تھی وہ سڑک۔ اور مسافر کو نہایت پسند تھی۔ آہستہ آہستہ ایک ٹوٹی پھوٹی عمارت کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ ہو نہ ہو یہ وہی سرائے ہے۔ جہاں وہ آرام کرنے کے لئے ٹھہریگا اور اس کے قدموں میں ایکدم تیزی ہوگئی۔ وہ اُس شکستہ عمارت کے سامنے رُکا۔ سوچنے لگا۔ "کیا واقعی وہ سرائے کے سامنے کھڑا ہے۔ اجنبی کی جان کو سینکڑوں جوکھیں"۔

" باجرے کے کھیتوں میں سے یکایک دو تین لڑکیاں ایک دیہاتی گیت گاتی ہوئی نکلیں۔ اُن کے ہاتھوں میں باجرے کی بالیاں تھیں اور وہ اُن کو بار بار نچا رہی تھیں۔ کبھی کبھی وہ اُن باجرے کی بالیوں کو ایک دوسرے کے گلابی رُخساروں سے مس کر دیتیں۔ ایک چوٹ کھائی ہوئی لڑکی بلبلا اُٹھی۔

" اُونہہ۔ بڑی آئی ہے بن کے۔ پرماتما کرے تجھے کسی موٹے کالے آدمی کے ساتھ باندھ دیا جائے۔ وہ تجھے بالکل ٹھیک کر دیگا"

" تو ایسی کونسی خوبصورت ہے۔ کیا چہرہ ہے۔ نخرے۔ چل اُتی دن بھر تو کھیت میں مرتی ہے اور اب خود اوپری بنی جائے ہے۔۔۔۔"

۔۔۔۔۔۔ دانت نکالتے مُنہ مسکاتے دوسری لڑکی بولی۔

" رہنے دو بہنا۔ لڑتی کیوں ہو۔ اپنے اپنے بھاگ۔۔۔۔" تیسری

ذرا سنجیدہ معلوم ہوتی تھی۔

مسافر نے اُن کی پُر لطف گفتگو کو سُنا۔ آگے بڑھا۔

" دیکھنا "۔

" کیا کہتے ہو مسافر "۔

" سرائے دیکھ رہا ہوں "۔

" تو کھڑا کہاں ہے۔ یہ دس پگ پرے سرائے ہے۔ اور کیا ہے "۔

پہلی نے دوسری کی طرف دیکھا' دوسری نے تیسری کی طرف اور پھر تینوں ہنسنے لگیں۔ اور مُنہ میں اپنی اپنی اوڑھنی کے آنچل کو دبا کر اُنہوں نے ہنسی کو بہت ضبط کیا مگر نہ کر سکیں۔ اور ایک نے دوسری اور دوسری نے تیسری کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالکر بھاگنا شروع کر دیا۔ بے تحاشا' بے معنی۔

مسافر نے تعجب کی نگاہ سے دیکھا اور پھر مسکرا کر اُٹھا۔ لیکن لڑکیاں بہت دُور پہنچ چکی تھیں۔ جو اس مسکراہٹ کا جواب دیتیں۔

آگے بڑھا۔ ٹوٹی پھوٹی مگر پکّی عمارت کے دروازے کو کھٹ کھٹایا اور پھر اُس عمارت کا معائنہ کرنے لگا۔ انیسویں صدی کی بنی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

دروازہ کُھلا۔ ایک سولہ سالہ لڑکی نے باہر جھانکا۔

مسافر سکتہ میں رہ گیا۔ معاملہ کیا ہے۔ وہ گھبرا کیوں رہا ہے۔ اُن لڑکیوں نے اُسی عمارت کو سرائے بتایا تھا لیکن ......

" کہاں چلے مسافر "۔

" کہیں نہیں۔ سرائے ڈھونڈھ رہا ہوں۔ کدھر ہے "۔

"یہی تو ہے آؤ"۔

"اچھا" اس وقت اس کی پنڈلیاں پھر دوبارہ درد کرنے لگی تھیں۔ ورنہ وہ چاندنی رات میں ہی اپنے سفر کو جاری رکھتا۔ اس نے آگے بڑھنے کی کوشش بھی کی۔ مگر لڑکی برابر دروازے پر ڈٹی رہی"۔

"ارے ہو مسافر۔ یہ ہی سرائے ہے"۔

"اچھا آیا"۔ ایک ایک قدم بھاری ہو رہا تھا۔ وہ چل نہیں رہا تھا۔ بلکہ ایک قدم کے بعد دوسرے کو گھسیٹ رہا تھا۔ ان وزنی قدموں کو کس طرح سنبھالے خیر جوں توں کر کے دس بارہ قدم پورے کئے۔

"چلو مسافر"۔

"اس سرائے کی تم ہی مالک ہو"۔ مسافر نے ہمت کر کے پوچھا۔

"اونہہ ہوں۔ میرا باپ اس سرائے کا مالک ہے۔ وہ اندر صحن میں بیٹھا ہے۔ تم تھک گئے ہو مسافر"۔

"ہاں جبھی تو میں سرائے میں آیا۔ نہیں تو اپنا سفر جاری رکھتا"۔

وہ اُس پُرشباب شوخ و شنگ لڑکی کے ساتھ اندر گھستا چلا گیا، کتنی خوبصورت، تمتماتے ہوئے رُخسار، بڑھی چتون، مسافر کو رہ رہ کر تعجب ہو رہا تھا کہ جنگل تو خیر نہیں مگر دیہات میں بھی ایسا حُسن پھوٹتا ہے، پرورش پاتا ہے۔ اور کھلی ہوئی فضا میں ہوا اور مینہ کے طوفان، زندگی کی کشمکش کے باوجود اسکی، ترو تازگی قائم رہتی ہے۔ وہ اُس حُسن سے کچھ مسحور ہو چلا تھا۔ اور کھویا سا جا رہا تھا۔

"ابا مسافر کو کونسی کوٹھری میں ٹھہراؤں؟"

بوڑھے نے ناریل کے حقّے کو گڑگڑاتے ہوئے جواب دیا۔

"ادھر آؤ مسافر تم تھک گئے ہو۔ بیٹھ جاؤ۔ سرائے میں کمروں کی کمی نہیں۔

چنّی جا وہ سامنے والی کوٹھری ٹھیک کر دے۔"

"تمہاری سرائے میں مُسافر کبھی کبھی آتے ہیں نا۔ آج کوئی اور مُسافر

نہیں ٹھہرا؟"

"بہت کم۔ پُرانی سرائے ہے۔ آجکل زمانہ میں لوگ سرائے میں کم ہی

ٹھہرتے ہیں۔ مہینوں میں کبھی کوئی بھولا بھٹکا آجاتا ہے۔ بزرگوں کی نشانی

ہے۔ ویسے کھیتی باڑی کا کام کرتا ہوں۔"

"چنّی! چنّی!"

"ابا۔ ابھی آئی"۔

لڑکی اپنے باپ کے پاس آئی۔

"ابا کوٹھری ٹھیک کر دی"۔

"میں لیٹنا چاہتا ہوں۔ بہت تھک گیا ہوں"۔ اور بڑھتے ہوئے اندھیرے

میں مسافر سرائے کے بوڑھے مالک کے دھندلے نقوش دیکھ رہا تھا، اور

یا ناریل کے حقہ کی گڑگڑاہٹ کو سُن رہا تھا۔

"کھانا کب کھاؤ گے"۔

یہ ہی دو گھنٹے بعد"۔

"اچھا"

لڑکی نے سچ مچ ہتھیلی میں سرسوں کے تیل کا دیا سنبھالا۔ اور کوٹھڑی کی طرف بڑھی۔ تھکا ماندہ مسافر پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ لڑکی نے کوٹھری کے آلے میں دیا رکھ دیا۔ مدھم روشنی پھیل گئی۔ مسافر نے دیکھا، کوٹھری کی دیواریں پختہ ضرور ہیں مگر جگہ جگہ سے چونے نے کھسکنا شروع کر دیا ہے۔ کڑیوں میں مکڑیوں کے لاانتہا جالے اور ایک سوندھا سوندھا تعفّن۔ معلوم ہوتا تھا کہ مدت سے کوٹھری کو کھولا نہیں گیا۔ چنّی دیے کے سائے میں بیٹھ رہی۔

"تم کہاں جاؤ گے مسافر"

"بارہ میل پرے، وہاں مجھے جا کر کچھ کام کرنا ہے۔ دو تین مہینے کے بعد پھر اپنے وطن کو واپس چلا جاؤں گا"

مسافر کھاٹ پر لیٹ گیا۔ چنّی اس دیے کے سایہ میں بیٹھی رہی دیے کی ہلکی پیلی روشنی میں چنّی کے رخسار سیب ایسی رنگت اختیار کرتے جا رہے تھے ڈنبالہ دار آنکھیں، اور نازک کونپل ایسے ہونٹ۔ وہ اپنی پلکیں برابر جھپکے جا رہی تھی۔ مسافر دزدیدہ نگاہوں سے اس کا مطالعہ کر رہا تھا، گدرایا ہوا حسن، سادہ مگر پُر رعب جو ہر انسان پر اپنا تسلط جما دے، خاموش بالکل خاموش چنّی بیٹھے بیٹھے تنکے سے کوٹھری کے فرش کو کریدنے لگی۔ اور اس کی مرمریں کلائیاں مسافر کے دل میں کھبی جا رہی تھیں۔ مسافر کا دل نیچے اوپر ہونے لگا۔ کیوں نہ وہ زندگی بھر اس سرائے میں قیام کرے۔ جہاں چنّی ایسا زندگی کا اعلیٰ ترین حسین خوبصورت ترین نمونہ پرورش پا رہا ہو۔ چنّی برابر نگاہ جھکائے تنکے سے کوٹھری کے فرش کو کریدے جا رہی تھی۔ اور اس کی چوڑیاں، پاس والے گاؤں کے منہیار کے

ہاں تیار کی ہوئی کانچ کی چوڑیاں آپس میں ٹکرا کر ایک نہایت لطیف مگر سُریلی موسیقی
بیدار کر رہی تھیں۔ چنّی کی نگاہیں پتہ دیتی تھیں کہ وہ مسافر سے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔
مگر شاید اُس نے مُسافر کا تھکا ہوا چہرہ دیکھ کر صرف ایک ہی سوال پر اکتفا کیا۔

"چنّی وہاں بیٹھی ہوئی کیا کر رہی ہے۔ مسافر کو آرام کر لینے دو۔ مسافر کو بھوکا
مارنے کا ارادہ ہے کیا؟"

مُسافر کے پاس پوٹلی میں کھانا بندھا ہوا تھا۔ مگر وہ سوچنے لگا کہ پھر کبھی
کام آئے گا۔ کم از کم اس بہانے چنّی پھر اُس کی کوٹھری میں آئے گی، چنّی کو
دیکھنے کی تمنّا نہ معلوم کیوں اُس کے دماغ پر غلبہ پائے جا رہی تھی، اور شاید
وہ اسی اُمید میں اُس کوٹھری میں لیٹا بھی رہا تھا۔ کیا مجال کوئی انسان وہاں
ایک منٹ ٹھہر سکے۔ عجیب خوشبو سی کوٹھری کی فضا میں پھیلی نظر آتی تھی۔ کچھ
بخارات جیسے اُٹھتے معلوم ہوتے تھے۔ لیکن اس گھٹے گھٹے ماحول میں اُس نے
سونا پسند کیا۔ اگر وہ چاہتا تو صحن میں اپنی کھاٹ بچھوا کر سو رہتا۔ مگر کس طرح
وہ اور چنّی سرائے کے مالک کی نگاہ سے بچ سکیں گے۔

گھنٹے، دو گھنٹے نہ معلوم کتنے عرصہ تک مسافر سوتا رہا۔ کسی نے اُسے بُری
طرح جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔ وہ آنکھ ملتا ہوا اُٹھا۔ چنّی کھانا لئے کھڑی تھی۔

"ارے! میں بہت تھک گیا تھا۔ اس لئے پڑ کر سو رہا۔ کھانا لائی ہو،
رکھ دو۔"

مسافر نے کھانا کھانا شروع کیا۔ چنّی دیئے کے سائے میں بیٹھی رہی۔
دو گھنٹے پہلے شگفتہ کلی اب کھلتی جا رہی تھی۔ چنّی کی جاذبیت لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی

تھی۔ اور دیئے کی روشنی میں چنّی کے چہرے پر اندھیرے اور اُجالے کے تاثرات ایک عجیب حُسن کی تشکیل کرتے معلوم دیتے تھے، قدیم یونان کی کسی خوبصورت دیوی کے نقوش، وہ اُس وقت قطعی ایک پری بن گئی تھی۔ ایک تالاب میں کھلا ہوا کنول جس کو جتنی دیر دیکھا جائے اتنی اُس کی خوبصورتی میں اضافہ ہوتا جائے۔ ایک خوبصورت چیز کی تعریف ہی یہ ہے کہ اس کو جتنا پرکھا جائے اتنی ہی اس کی آب و تاب بڑھے۔ مسافر نے سرائے کے دروازہ پر چنّی کو محض ایک لڑکی کے بطور دیکھا۔ لیکن دروازہ والی وہ چنّی اب حَسین سے حَسین تر ہوتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ دیئے کے سایہ میں سُکڑی سُکڑائی، سمٹی سمٹائی، کچھ لجائی سی چنّی مسافر کے دل کے تاروں کو مضطرب کر رہی تھی۔ اور اُس کی نگاہ بار بار اُس حُسن بلیح کے جالے میں اٹک کر رہ جاتی۔

"مسافر! کچھ چاہیئے"

"چاہیئے کیا۔ سب کچھ موجود ہے یہاں چنّی۔ مجھے بہت آرام ہے یہاں اور بھلا کس چیز کی ضرورت"

"ضرورت تو ہے۔ مگر ...."

"مگر کیا؟"

"کچھ نہیں، مجھے سونے دو۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔ یہ دیا بجھاتی جانا" مسافر نے کھاٹ پر پڑے پڑے اپنے آپ کو اینٹھا دیتے ہوئے کہا۔ اُسے چنّی کو دیکھتے دیکھتے نزاکت کا احساس ہونے لگا تھا۔ نازک چیز کو بجھ کر نازک بننا ہی پڑتا ہے۔

چینی چلی گئی۔ "ضرورت تو ہے۔" مسافر سوچنے لگا، اُسے اور کس بات کی
ضرورت ہے۔ کھاٹ ہے سونے کے لئے، مکان کا سایہ ہے۔ کھانا وہ
کھا ہی چکا ہے۔ اور نیند وہ جلدی یا دیر میں اُس پر غلبہ پا جائیگی اُسے اطمینان
ہے، اور وہ فراغت کے خواب میں جلد ڈوب جائے گا۔ لیکن اُس نے دیکھا
کہ دیا متواتر جلے جارہا ہے۔ اور چھوٹے چھوٹے پتنگے اُس پر بے شمار تعداد میں
قربان ہورہے ہیں۔ ایک چھوٹے سے دیئے کے اتنے عاشق اور چینی وہ بھی
ایک دیا ہے۔ اور اس کے پروانے۔ جانے دو۔ بے مطلب باتوں کے چکر میں
پڑنا فضول ہے۔ رات خاموش سے خاموش تر ہو چلی۔ صحن میں بیٹھے ہوئے
سرائے کے مالک نے حقہ گڑگڑانا بند کر دیا۔ صرف کبھی کبھی بہت دُور شاید اُن
جوار اور باجرے کے کھیتوں سے پرے منجیروں کی مدھم نگر مست کُن موسیقی
ٹکڑے ٹکڑے ہو کر سُنائی دے جاتی تھی۔ مسافر کو دیئے کے سایہ میں چینی کی
شبیہ بنکر بکھر ڈھلتی نظر آتی تھی۔ چینی کے نقوش مسافر کی آنکھوں میں اس قدر
منعکس ہو چلے تھے کہ دیئے کے سایہ میں اُس بیٹھی ہوئی چینی اور اس کے دلکش
چہرے کا احساس رہ رہ کر جاگ رہا تھا۔ اعضا درد کے مارے تڑپ رہے تھے
بنڈلیوں نے پھر درد کرنا شروع کر دیا۔ اور نیند، وہ جلد ہی مسافر کو اپنے مسکن کا
باشندہ بنانا چاہتی تھی مُسافر سویا، اور نہایت فراخ دلی کے ساتھ، صبح جب
بیدار ہوا تو مہرِ عالمتاب کافی فاصلہ طے کر چکا تھا، مسافر کی معصوم نگاہیں صاف
بتارہی تھیں کہ وہ بالکل اس بات سے بے خبر ہے کہ چینی رات کو دوبارہ مُسافر کی
کوٹھری میں آئی تھی اور چلی گئی تھی۔ شاید چینی کے لئے مُسافر میں کوئی

کشش تھی۔

مسافر چارپائی کو چھوڑ اٹھ کھڑا ہوا۔ کوٹھری کے دروازے پر چنی نمودار ہوئی۔

"سوچ کے مسافر۔ اب کیا ارادہ ہے"۔

"سفر جاری رکھنا چاہتا ہوں۔ ذرا پہر ڈھلے سے پہلے منزل پر پہنچ جاؤں گا"۔

"مسافر ایک دن تو اور ٹھہرتے۔ یہاں دیکھنے کے لئے بہت اچھی اچھی چیزیں ہیں"۔ چنی کی نس نس مسافر سے درخواست کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

مسافر نے سوچا۔ اُسے جاتے ہی کام تھوڑے مل جائیگا۔ وہ تو وقت مقررہ سے دو تین دن پہلے سے چل دیا تھا تاکہ مالک خوش ہو جائے۔ سرائے کے آس پاس، سرائے کے اندر قابل دید چیزیں بہت زیادہ تعداد میں تھیں۔ اس میں شبہ ہی کیا ہے۔ سب سے زیادہ قابل دید چیز تو اُس کے سامنے ہی کھڑی تھی۔ مسافر نے تھوڑی دیر سوچا۔ اور پھر۔

"اچھا کل چلے جائیں گے"۔

"تم بہت اچھے ہو مسافر"۔ چنی نے اپنے چمکیلے ہونٹوں کو نزاکت سے حرکت دیتے ہوئے کہا۔

سڑک کی اُس سمت، سرائے کے گرد و نواح میں دن ڈھلنا شروع ہوا۔ مسافر سرائے کے مالک سے باتیں کرنے لگا۔ چنی بار بار اِدھر سے اُدھر پھرتی پھراتی مسافر کی نگاہ کے سامنے آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سرائے کا

بوڑھا مالک بڑا باتونی واقع ہوا تھا۔ وہ معنی بے معنی گفتگو کئے جا رہا تھا۔ اور سامنے رکھے ہوئے ناریل کے حقے میں کبھی کبھی کش بھی لگا لیتا وہ کہتا تھا میری بیوی ایسی خوبصورت تھی۔ آس پاس کے دیہات میں اس جیسی حسین عورت چراغ لیکر ڈھونڈھنے سے بھی نہ مل سکتی تھی لیکن اُسے مرے ہوئے بارہ سال ہو گئے۔

اور چنی جب چار سال کا بچہ تھی۔ مسافر ان باتوں کو نہایت دلچسپی سے اور کان لگا کر سُن رہا تھا۔ لیکن بوڑھا آدمی کسی کام کے لئے سرائے سے باہر نکلا اور گفتگو خاتمہ پر آئی۔

مسافر سرائے سے باہر نکلا اور جوار باجرے کے کھیتوں سہارے سہارے چہل قدمی کرنے لگا۔ چنی ایک باجرے کے کھیت میں سے نمودار ہوئی۔ اُسکے ہاتھ میں باجرے کی پکی ہوئی دو بالیاں تھیں۔

"مسافر۔ یہ ہمارا ہی کھیت ہے۔ آگے چلو۔"

کچی منڈیر تھی۔ اور آس پاس باجرے اور جوار کے کھیت، پانچ پانچ چھ فٹ قد آدم پودوں نے اُس منڈیر کو کھیتوں کے سہارے سہارے چلنے والے راہگیروں کی نگاہوں سے چنی اور مسافر کو اوجھل کر دیا۔ چنی نے باجرے کی بالیوں کو اِدھر اُدھر لچکانا شروع کیا۔ اور پھر وہ اُس کچی منڈیر پر بیٹھ رہی۔

"بیٹھ جاؤ مسافر"

"اچھا"

"مسافر" چنی نے ایک بالی سے دوسری بالی کو ٹکرایا۔ اور سر کا پلہ نیچے آ رہا۔ چنی نے سر ڈھانپنے کی کوشش بھی نہ کی۔

"مسافر تم بہت اچھے ہو۔ دل چاہتا ہے کہ تم اسی سرائے میں ٹھہر جاؤ۔"

"کیوں؟"

"کیوں؟ مسافر تم کچھ نہیں سمجھتے۔ اتنے بڑے ہو چلے ...... اس ہوا کے چلنے سے میرے سر میں درد ہو جاتا ہے مسافر۔"

ہوائیں برابر ہرے ہرے نازک پودے لہرا رہے تھے۔ اور مسافر کے دیکھتے دیکھتے چنی نے اپنے سر کو مسافر کے منڈیر کی ڈھلوان کے ساتھ ساتھ جھکی ہوئی ٹانگوں پر رکھ دیا۔

"کیا بات ہے چنی؟"

"سر میں درد ہے۔ اُف۔" چنی نے سر کو اوپر اٹھا لیا۔ اس نے مسافر کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال دیں۔ مسافر کی آنکھوں میں حیرت کی جھلک نمایاں طور سے نظر آ رہی تھی۔

سرائے کے بوڑھے مالک نے پکارا۔ "چنی او چنی۔ کدھر گئی؟"

"آئی ابا۔ مسافر تم آگے بڑھ کر اور کھیتوں کی سیر کر آؤ۔"

مسافر اس منڈیر کے سہارے سہارے کھیتوں کی وسعت کو چیرنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر چنی اس سے کیا کہنا چاہتی تھی۔ خیر اس الجھن میں پڑنے سے کیا حاصل۔ اب کی بار وہ اس سے ٹھیک طور سے دریافت کرلے گا۔ آخر وہ چاہتی کیا ہے۔

دوپہر کے وقت چنی مسافر کی کوٹھری میں کھانا لائی۔ اور مسافر کے سامنے

رکھ کر بیٹھ رہی۔ اُسی رات والے آلہ کے عین نیچے۔

خواہ مخواہ اس مرتبہ بھی چنّی کا پلّہ سر سے نیچے آ رہا۔ اور مسافر نے دیکھا کہ اس کی باریک کرتی کے پیچھے چنّی کا سینہ نیچے سے اُوپر ہو رہا ہے۔ چنّی پھر زمین پر تنکے سے بے معنی لکیریں کھینچنے میں مشغول ہو گئی۔

مُسافر تھوڑا تھوڑا سمجھنے لگا۔ سرائے کی کوٹھری اُسے کاٹ کھانے کو دوڑنے لگی۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ چنّی اس قدر آگے بڑھ جائیگی۔

کھانا کھانے سے فراغت پاکر مُسافر سرائے کے مالک کے پاس گیا پیسے چکائے، اور کوٹھری میں آ کر اپنا سامان دُرست کرنے لگا۔

چنّی پھر کسی بہانے کوٹھری میں نمودار ہوئی۔ اُس کے رُخسار تمتما رہے تھے۔ کرتی کے بٹن ڈھیلے پڑ چلے تھے۔ دھوتی کا پلّہ کوٹھری کے دروازے کے اندر گھستے ہی سر سے آ رہا تھا۔ وہ مسافر کے عین نزدیک جاکر کھڑی ہو گئی مسافر کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ چنّی کے دل کی حرکت کی صدا تک کو سُن رہا ہے۔ اور خاموش بُت کی طرح کھڑی ہوئی چنّی اس سے پھر کچھ التجا کرنی چاہتی ہے۔

"مسافر" چنّی نے پوٹلی کو ہاتھ سے چھینتے ہوئے کہا۔ "آج کی رات اور ٹھہرو مسافر" پوٹلی ہاتھ سے گر پڑی۔

اور مُسافر نے دیکھا۔ کہ عین اُس کی نگاہ سے دو فٹ کی دُوری پر چنّی کا سینہ دھڑک رہا ہے۔ اور اُس کی گوری گوری کلائیاں مایوسی اور نا اُمیدی کی ایک کشمکش میں ہیں۔

"چلدئے مسافر۔ پھر کبھی اس سرائے میں آؤ گے"۔

"کیا پتا۔ اس دُنیا کا حال کسی کو معلوم نہیں۔ آج کیا ہونے والا ہے، کل کیا ہو گا۔ اور مجھے تو اکثر یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ کل کیا ہوا تھا۔ اچھا اب ہم چل دئے"۔

"مسافر تم جیسا بھولا آدمی اب تک اس سرائے میں نہیں آیا"۔ چنّی نے غصّہ کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

مسافر کے سامنے اب وہی پکّی سڑک تھی۔ بارہ میل کا سفر طے کرنا تھا۔ جتنے قدم آگے بڑھتے تھے اتنے ہی قدم پیچھے سرائے بھاگی جا رہی تھی اور مسافر اُسے پیچھے چھوڑنا بھی چاہتا تھا۔ کچّی پٹری پر مٹّی کے ڈھیلوں کو فٹ بال کے مانند لڑھکاتا درختوں کی نیچے جھکی ہوئی ٹہنیوں کو توڑتا کچّے پتّوں کو خواہ مخواہ چباتا اور تھوکتا وہ آگے بڑھا چلا گیا۔ چھ میل کا سفر طے کرنے کے بعد پھر اُسے تھکن کا احساس دم بدم کم ہمتی کی طرف راغب کرنے لگا۔ وہ سوچنے لگا آیا وہ سستائے یا سفر کو جاری رکھے۔ ہرج ہی کیا ہے۔ شیشم کے سایوں کی سڑک پر کمی نہیں۔ اور اپنی پوٹلی سے چادر نکالی۔ اور زمین پر بچھا کر پھر لیٹ رہا۔

ایک آدمی کے سر پر صافہ، پاؤں میں دھوڑی استر کا جوتا۔ اور دوسرا ننگے سر ننگے پیر، اُسی شیشم کے سائے میں آ کر بیٹھ گئے۔

"کدھر جا رہے ہو جی"؟

"چھ میل پرے قصبہ میں جانا ہے، رات کو سرائے میں ٹھہر گیا تھا۔ مگر سفر کی تھکن اب بھی نہیں اُتری"۔

سرائے کا نام سنتے ہی نو واردوں کے چہروں کی رنگت بدلی۔

" اُسی سرائے میں جہاں ایک بوڑھا آدمی رہتا ہے اور اُس کی خوبصورت لڑکی "

" ہاں ہاں! مسافر اُن دونوں آدمیوں کی طرف زیادہ متوجہ ہوگیا۔

" لڑکی تو بہت خوبصورت ہے صاحب۔ مگر۔ ۔ ۔ ۔"

" مگر کیا؟" مسافر نے حیرت سے پوچھا۔

" اجی اگلے سال وہ ایک مسافر کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ بوڑھے کو پتہ لگا۔ اور اپنے واقف نمبردار کا گھوڑا لے وہ اپنی لڑکی کی تلاش میں نکلا۔ پاس والے گاؤں میں کھلبلی مچ گئی۔ دن نکلنے میں دو گھنٹہ کی دیر ہو گی "۔ پھر متکلم اپنے دوسرے ساتھی کی طرف دیکھنے لگا۔" اور پھر وہ چنّی کو پکڑ کر لے آیا "۔

" اور مسافر کا کیا ہوا؟"

" اجی اُس کا کیا قصور۔ وہ کہنے لگا کہ چنّی اپنی مرضی سے اُس کے ساتھ آئی ہے۔ بوڑھے نے مسافر کو دو چار بات سنا کر جانے دیا۔ بھیا جب اپنا پیسہ کھوٹا ہو تو پرکھنے والے کا کیا قصور۔ ۔ ۔ ۔ چنّی سرائے کے سامنے ڈرتی سی آکر کھڑی ہوگئی۔ سرائے کے بوڑھے مالک نے سڑک پر شیشم کے درخت میں سے ایک بہت لچکیلی اور ہری ہری ڈنڈی کو توڑا۔ اور چنّی کو اُس سُتی سُتائی ٹہنی سے پیٹنا شروع کیا۔ سارا گاؤں گھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔

" سرائے کے مالک نے اس کی شادی کہیں نہ کر دی "۔

مسافر کے اس سوال پر متکلم ہنسا۔

"بھیّا شادی تو اس کی ہو چکی تھی۔ مگر قسمت میں شادی کا سُکھ بھوگنا بھی ہو ..... بوڑھے سے لوگوں نے کہا دوسری شادی کر دے۔ مگر وہ گردن ہلا کر کہہ دیتا ہے کہ ہمارے خاندان میں بیوہ کی شادی کبھی نہیں ہوئی۔"

"اچھا ہم چلے۔ قصبہ چھ میل پرے ہے نا؟"

"ہاں۔ اتنی ہی دُور ہو گا۔"

چنّی مسافر کے ساتھ بھی تو بھاگنا چاہتی تھی، نہیں اُس نے کبھی نہیں کہا۔ کہ وہ اُسے اپنے ساتھ لے چلے۔ مُسافر کی خالی ہاتھ کی مُٹھی غیر ارادی طور سے بھنچی سی جاتی تھی۔ اُسے سرائے کے بوڑھے مالک پر غصہ آرہا تھا۔ اُسے چنّی کی شادی کر دینی چاہیئے ورنہ پھر کسی دوسرے مسافر کے ساتھ بھاگنے کی کوشش کرے گی۔ وہ مجبور تھا۔ اپنے گاؤں میں بیوی بچوں کو چھوڑ کر چلا تھا۔ جب وہ کمائی کر کے اپنے گھر واپس لوٹے گا تو بچے اس کو دیکھ کر پھولے نہ سمائیں گے، اور اُس کی بیوی اُس کی طرف دیکھے گی تو وہ اُس سے کہدے گا کہ اُس نے اپنی بیوی کی امانت کو کسی کے حوالہ نہیں کیا۔ اگر کر دیتا تو اچھا تھا۔ خیر شام پھر سر پر آرہی ہے سڑک بتدریج سایوں کے لپیٹ میں آکر اپنی چمک کو کھوئے دے رہی ہے وہ وہ شفق کے نظارے کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ شاید اس شفق نظارہ میں وہ پھر کبھی کسی سرائے میں گم نہ ہو جائے۔ وہ سوچنے لگا کہ سڑک کیوں اتنی خاموش رہتی ہو۔ یہ سڑک بھی عجیب ہے۔ اُس نے زندگی بھر ایسی سڑک نہیں دیکھی۔ چوبیس گھنٹہ متواتر مسلسل سوتی رہنے والی سڑک۔

سرائے گیارہ میل پرے رہ گئی، مسافر کو شام کے دھندلے میں قصبہ کی

پکّی عمارتوں کے کالے کالے مٹے مٹے نقوش دکھائی دینے لگے ۔ چھوٹا قصبہ ہے ۔ اُسے مطلوبہ جگہ کا پتہ لگانے میں کچھ دیر نہیں لگے گی ۔

پچیس منٹ کے بعد وہ سڑک کے خاتمہ پر پہونچ گیا ۔ ایک دیہاتی نوجوان اپنی بیوی کے ساتھ قصبہ سے باہر نکلا عورت نے ڈیڑھ گز کا گھونگھٹ نکال رکھا تھا ۔ مسافر نے عورت کے سخت گورے ہاتھوں کی طرف دیکھا ۔ جن میں سُرخ موٹی بھدّی چوڑیاں کھنک رہی تھیں ۔

کہیں وہ نوجوان اُس عورت کو بھگا کر تو نہیں لیجا رہا ؟

مسافر نے عجیب انداز سے گردن کو ہلایا ، نہیں ایسا نہیں ہو سکتا اور پھر سڑک کے عین خاتمہ پر پہونچکر مسافر نے بہت مدہم آواز میں اپنے آپ سے کہا ۔

" کیا ہی اچھا ہو کہ چتّی کسی مسافر کے ساتھ بھاگنے میں کامیاب ہو جائے ؟

لیکن سڑک کے خاتمہ کے بعد قصبہ کی رتیلی اور پیروں تلے دبی رہنے والی سڑک پر قدم رکھتے ہی ، مسافر کے دماغ سے سرائے چتّی ، شیشم کے سائے اور شفق کے نظارے کا خیال محو ہوتا چلا گیا ۔

"ایشیا" اگست ۱۹۴۲ء

آخری چاک

وہ کالج کے دروازے پر خاموش کھڑا تھا۔

اُس کے کوٹ کی کچھ تھوڑی سی پھٹی ہوئی جیب میں ایک سفید چاک پڑا تھا۔ دُودھ سے بھی زیادہ سفید۔ بیوہ کی ساری سے زیادہ چٹا۔ اتنا سفید جتنا کہ وہ بھیڑ کے بادل ہوتے ہیں جو نیلے آسمان کے نیچے روئی کے گالوں کی شکل اختیار کر جھولا جھولتے ہیں۔

اُس کا ہاتھ ایک دم جیب کی گہرائیاں عبور کرنے لگا۔ اور اُس کی نازک انگلیاں چاک سے لہو و لعب میں مشغول ہو گئیں۔ وہ خواہ مخواہ اُس چاک کو

باہر نکال کر دیکھنا چاہتا تھا۔ سورج کی روشنی میں کالج کے دروازے کے سائے میں۔ اُس کی دو انگلیوں نے چاک کو تھاما اور وہ اُس بے جان ہستی کو دُنیا کا نظارہ کرانا چاہتی تھیں کہ یکایک چاک ایک دم اُن کی گرفت سے چھُوٹ گیا۔

کالج کا گھنٹہ بجا۔ اور ساتھ ہی ساتھ کالج کی دو تین طالبات دروازے پر نمودار ہوئیں اور بس کا انتظار کرنے لگیں۔

اُس کی نگاہ ایک دم اُن مغرب زدہ ہندوستانی لڑکیوں کی طرف مخاطب ہوئی۔ مصنوعی حُسن، بالکل بناوٹی، شیشہ کنگھا، پاؤڈر، غازہ کا محکوم۔ آنکھ پر نازک عینک۔

وہ لجتہائے عشوہ و ناز، گفتگو میں مصروف ہوگئیں۔

"تم نے "گون وِد دی ونڈ" دیکھا ہے اوشا؟"

"کیوں نہیں مسٹر رؤف کے ساتھ گئی تھی۔"

"کون سے مسٹر رؤف؟"

"یہی بزم کے سکریٹری۔ کہتے تھے لڑکیوں کی نمائندہ بن جاؤ۔ یعنی بزم ادب کی نائب سکریٹری۔"

"ارے پھر بن کیوں نہیں جاتی؟" اندرا نے پاروسول کو ہلاتے ہوئے کہا۔

"جانے بھی دو اندرا۔ ان خشک چیزوں سے کیا سروکار، ارے ہاں!"

"کیا ہوا؟"

"بھئی اس ویرائٹی شو میں بھی پارٹ لینا ہے یا نہیں۔ آپ ڈانس میں

حصہ لیں گی یا نہیں"۔

موٹر کی پوں پوں نے اُن طالبات کی گفتگو میں رخنہ اندازی کی اور تینوں بس میں سوار ہو گئیں۔

وہ دیکھتا ہی رہ گیا۔

لیکن اُسے ان چیزوں سے دلچسپی نہیں۔ بیکار بے مطلب۔

شاید وہ لڑکیاں بس میں بیٹھی اُس کا مذاق تو نہیں اُڑا رہی ہوں گی۔

"ریاضی کا پروفیسر۔ نوجوان، مخبوط الحواس دروازے پر دھرنا مارے کھڑا ہے"۔

ٹھیک۔ مگر ریاضی کا پروفیسر وہ بنا ہی کب تھا۔ محض عارضی، عارضی لکچرار۔ اور آج اُس کا آخری دن ہے۔ جبھی تو کالج کے دروازے پر خاموش کھڑا ہے۔ چُپ چاپ۔ کچھ نہیں۔ یوں ہی۔ اُسے محبت ہے کالج کے درودیوار سے۔ اپنے طالبِ علموں سے، کلاس رُوم سے۔ اور سٹاف روم سے یک گونہ اُنسیت۔

وہ سال بھر سٹاف روم میں روزانہ جاکر بیٹھا۔ لیکن اس کو ساتھی لکچراروں سے بولنے کی ہمت نہ پڑی۔ شاید اُس نے بولنے کی کوشش کبھی نہ کی۔ اگر کبھی کی تو لفظ حلق میں اٹک اٹک کر رہ گئے ہیں۔ اور وہ سٹاف روم کے ہمیشہ دس منٹ تیز چلنے والے گھنٹے کی طرف دیکھتا رہا ہے۔ یا وقت گذارنے کے لئے اخبارات سے دل لگانے کی کوشش کی ہے۔ اور اگر اُس کا دل لگانا ایک بہت مشکل کام ہو گیا ہے تو باہر کورٹ یارڈ میں پڑی ہوئی بنچ پر جاکر بیٹھ رہا ہے۔

سٹاف کے معتبر بچوں ایسی خصلت رکھنے والے لکچراروں کی چیخ پکار سنکر۔

"ہلو! کہئے مزاج شریف"۔

"مہربانی"

"کیا سوچ رہے ہو یار" نو وارد گدے دار کرسی پر دھم سے بیٹھ کر کہتے ہیں۔

"کچھ نہیں"

"کچھ بھی"

"یار اس کالج میں خواہ مخواہ آیا۔ سرکاری نوکری کرتا تو آج پورے سات سو ملتے ہوتے۔ کیوں ساڑھے تین سو روپوں پر پڑا رہتا"

اور الگ ہیبت کی کرسی پر بیٹھا ہوا جونیر لکچرار اس گفتگو کو حیرت زدہ آنکھیں دکھاتا ہوا سُنتا۔ اور شاید سوچتا ہے گھنٹہ دو گھنٹہ کام مگر پھر بھی صبر نہیں۔ ساڑھے تین سو۔ اور یہاں کالج کے پہلے گھنٹے سے آخری گھنٹے تک دماغ فروشی کرنا۔ سینئر لکچراروں کی مزیدار باتوں کو سننا۔ اور تو اور کالج کا کلرک بھی تو سلام کرنا اپنی توہین سمجھتا ہے۔ غرضکہ چپراسی تک اڑان گھاسیاں دکھاتا ہے اور تنخواہ وہی۔

کالج کا گھنٹہ پھر اس کو کلاس روم کی طرف لے جانے کی دعوت دیتا ہے۔ جہاں اُسے "مہربانی کر کے بیٹھ جائیے"۔ "خاموش ہو جائیے"۔ اور نہ جانے کیا کیا جتن کر کے، کالج کے طالب علموں کو لکچر دینے کے لئے مناسب ماحول بنانا پڑتا ہے۔ اور جب وہ کلاس چھوڑ کر جاتا ہے تو لڑکے پیچھے سے چلاتے ہیں

ماسٹر جی - ماسٹر جی "جن سے کالج کے نئے لیکچراروں کو ازلی نفرت ہے - یعنی
کالج کے لیکچرار - اور ماسٹر جی، باجہ بجانے والے، ہارمونیم سکھانے والے ماسٹر جی
میں کچھ فرق ہی نہیں - لیکن "ماسٹر جی" بغل میں رجسٹر دبائے، گردن جھکائے
خاموشی کے ساتھ سٹاف روم کا راستہ لیتے ہیں - اور پسینے میں تر بتر ہو جاتے
ہیں - سوچتے ہیں لڑکوں کو پڑھانا کتنا مشکل کام ہے!

اور وہ ٹھہرا ریاضی ایسے خشک مضمون کا لیکچرار - گھنٹے کی آواز ہوتے
ہی چاک سنبھال کلاس روم ہی کی طرف چل دیتا ہے - پورے چالیس منٹ سینما
کے ایکٹر کی طرح اِدھر اُدھر ہاتھ ہلانا، کبھی طالب علموں کی طرف اور کبھی تختۂ سیاہ
کی طرف منہ پھیرنا - ڈسٹر ( ) اس کا جیون ساتھی ہے - اور چاک
کے باریک ذرات اس کے کپڑوں اور بالوں میں بھر جاتے ہیں - اور اُس کے
ہاتھوں میں چمٹ جاتے ہیں -

شروع شروع میں وہ کچھ گھبرایا - لیکن جوں جوں اُس نے اپنی قابلیت کے
جوہر دکھائے لڑکے اس کے گرویدہ ہو گئے - پھر بھی وہ اپنے طالب علموں کو سلام
کرنے میں سبقت لے جاتا ہے - وہ طالب علموں اور لیکچرار میں کچھ فرق نہیں سمجھتا - وہ
سمجھتا ہے کہ طالب علم اور لیکچرار کا رشتہ رواداری اور برادرانہ تعلقات پر مبنی
ہونا چاہیئے - اس لئے لڑکوں کو اُس سے ہمدردی ہے -

آج وہ آخری بار اپنے طالب علموں سے ملنے آیا تھا - خیرباد کہنے - وہ اُن سے
ملا اور ایک دوست کی طرح، اُن کی کامیابی اور ترقی کی دُعا دیتے ہوئے - سچے
دل سے دُعا - گو اُس کا دل روتا تھا - مگر اُس کے چہرے پر بشاشت تھی، اور

قناعت کا نور۔

اور کچھ شکست سا کالج کے دروازے پر آکر کھڑا ہوگیا تھا۔ کالج کی محبت اُسے مجبور کر رہی تھی۔

اُسے اس طرح کھڑے کھڑے آدھ گھنٹہ ہوگیا۔

پھر اُس نے دیکھا ایک سینئر لکچرار کو۔ جو بصد شانِ امتیاز بجری کی سڑک پر گامزن تھے۔ ایک نیا انداز! ایک نئی چال۔ مستانہ روی اور شاید رُعب گانٹھنے کا سوانگ۔ مجال ہے کہ لڑکے اُن کے سامنے دانت نکال دیں یا کچھ بول سکیں۔

اور وہ چند گھنٹے پہلے ریاضی کا لکچرار اور اب ایک معمولی انسان۔ عوام الناس کا ایک جزو۔ سڑک پر چلنے لگا۔ سفید چاک اُسے بوجھ معلوم ہونے لگا۔ اس نے جیب سے نکالا۔ حیرت سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔ اور پھر اُس چاک کو بدرو میں پھینک دیا۔

شاید یہ آخری چاک تھا جو اُس کی جیب کی گہرائیوں میں سویا۔

"ساقی" ستمبر سنہ ۱۹۴۱ء

یہ عمارتیں

جب رات کا سایہ زمین پر پھیلنے والی کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے تو چاند کی پھیکی پھیکی روشنی کبھی آدھی رات گئے، کبھی چوتھائی رات گزرے، کبھی سرِ شام ہی سے عمارتوں پر نازل ہو جاتی ہے۔ اور چونے گارے کی زدہ ردکوں سے محوِ گفتگو ہو جاتی ہے۔ اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ آنسو اور رقص، خوشی اور غمی، حسد اور ہمدردی، محبت اور نفرت کے راگ چاند کی پھیکی پھیکی عاجز روشنی میں دیواروں کے ننھے ننھے سوراخوں سے پھوٹ نکلتے ہیں۔ وقت کے صفحات پر لکھے ہوئے مختلف گیت، مدوجزر کا ہلکا ترنم، رقاصوں کی پشواز، اور گھونگھروں

کی منظم موسیقی کے ساتھ ملکر شباب اور رعنائی کی گھٹی گھٹی آوازیں، بچوں کی معصوم آوازیں، گذرے ہوئے زمانے کی بازگشت، کچھ مدھم مدھم مایوسی اور اضطراب کے بحرِ بیکراں میں ڈوبی ہوئی۔ چاند کی پھیکی پھیکی روشنی ہر رات ان سنجیدہ اور فلسفیانہ انداز سے دنیا کے سینے پر دال دلنے والی عمارتوں سے محو گفتگو رہتی ہیں۔ انسان وحیوان، زندگی اور موت...... سب کچھ، روزِ ازل سے لیکر موجودہ زمانے تک کی باتیں، سلطنتوں کے ردو بدل، جنگ وجدل کے خونین رُلانے دینے والے رقت آمیز واقعات، حسینانِ جہاں کے وقت کی ترقی کے ساتھ ساتھ مُردہ رُوح میں بیداری کا جیتا جاگتا احساس...... اور تڑپ تڑپ کر حرم سرائے میں ختم ہو جانے والیاں، اور دریا میں کُود کر جان دے دینے والی خاموش دوشیزائیں اور اُن کی تڑپ کو اِن عمارتوں نے جذب کر لیا ہے۔ یہ کھڑی رہتی ہیں نئے اضطراب، نئی دھڑکنوں کو اپنے تن میں جذب کرنے کے لئے اور پھر چاند کی پھیکی روشنی میں اپنا حالِ دل کہنے کے لئے۔ جب آسمان سے تارے ٹوٹتے ہیں تو چاند کی روشنی تھرا جاتی ہے۔ دیواریں یا عمارتیں اپنے سینے میں کسی نئے تھکے ہوئے مسافر کو پناہ دیدیتی ہیں۔ نئی چیز پُرانی، اور پُرانی چیز کھوتی کھوتی پھر نمودار ہوا چاہتی ہے۔

انسانیت کے بچپن کا خواب...... عمارتیں۔ انسانیت گُرسنہ نہیں تھی آزاد تھی۔ مگر وہ آزادی سے جلد تنگ آگئی۔ نیلے آسمان کے نیچے دُنیا کا پھیلاؤ اُسے پسند نہ آیا۔ درختوں، حیوانوں، قُدرت کے منظروں اور آبشار کے تڑپتے ہوئے سینوں میں پوشیدہ نغموں میں اُسے کچھ بھی نظر نہ آیا۔ حسن آزاد تھا نسل

انسانی نے اُسے سماج کی قید و بند میں جکڑ نہ رکھا تھا، بلکہ وہ چشموں کے کنارے کیلے کے ہاتھی کے کان ایسے ہلتے ہوئے پتّوں کے لرزتے ہوئے سایوں میں برفیلی چوٹیوں والے پہاڑوں کے دامن میں حسین نغمے زندگی کے مست الست رباب پر مانند سیماب تڑپتے تھے۔ زندگی، حُسن، آزادی سب مل جل کر خلط ملط ہو چکی تھیں۔ پھر انسانی آواز پکار اُٹھی تبدیلی . . . . . حسد، خود غرضی، نفرت و حقارت کا پیش خیمہ، اور پہاڑیوں کے دامن میں آوازیں سُنائی دینے لگیں۔ کیسی ؟ . . . . .

"میں تیر و ترکش سے تیری رکشا کروں گا اے محبوب۔ تمہارے رُخسار کنول کی نازک پتّیوں کو شرماتے ہیں۔ میں یہ پھل پھول بڑی جد و جہد کے بعد تمہارے لئے لایا ہوں۔ قبول کرو گے؟" متکلم کی شرم ڈھانپنے کے لئے پتّوں اور ٹہنیوں کا لباس، گلے میں جنگلی پھولوں کی مالا اور کندھے پر ترکش، ہاتھ میں کمان، بال بکھرے ہوئے، آنکھوں میں انسانیت کے بچپن کی جھلک، تھوڑی تھوڑی شرم جو آہستہ آہستہ ڈھلتی جا رہی تھی۔

"میرے محبوب"۔ دوشیزہ کی آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آتے۔ وہ اکثر کانپ اُٹھتی اور اپنے پھولوں سے گندھے سر کو نوجوان کی چھاتی کے سہارے جھکا دیتی۔ دریا اور پہاڑ میں محبت کی آواز جذب ہو جاتی۔ یہ گونج ایک وادی سے دُوسری وادی میں گونجتی صفحہ گیتی کے کونے میں پھیلتی چلی۔ پھر آزادی کا احساس اُونگھنے لگا۔ دُنیا کی مسرت گھٹنی شروع ہو گئی اور زندگی کا رباب انسانیت کے اشارے پر غلط راگ الاپنے لگا۔ بالکل جھوٹے راگ، نسلِ آدم کو آرام طلبی

کی عادت رفتہ رفتہ تنگ کرنے لگی۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر؟

کچھ ایسی ایسی تانیں قرطاسِ سماعت سے ٹکراکر رات کے اندھیرے میں گُم ہونے لگیں۔

"میرے محبوب، میں تمہارے لئے ایک چھوٹا سا گھر بناؤں گا۔ تم اُس میں آرام سے زندگی بسر کرنا۔ میں دن رات محنت کر کے تمہاری اور تمہارے خاندان کی حفاظت کرونگا۔ تم اپنے گھر کے دروازے پر شام کے وقت میرے استقبال کے لئے دروازے پر کھڑی ہو کر انتظار کرنا۔ اس وقت تمہارے بالوں میں گُندھے ہوئے جنگلی پھول، ٹانگوں میں پھولوں کے گجرے اور گلے کے گرد کوڑیوں کی مالا کتنی سُندر معلوم ہوگی۔ اور جب سورج دیوتا پہاڑیوں کے سلسلے پر جھک جائے گا تو آسمان کی غیر منتہائی جھیل کا سایہ تمہارے سُرخ رخساروں پر ہلکا ہلکا نیلا رنگ بکھیر دے گا۔ میری محبوبہ۔ ۔ ۔ ۔" نوجوان کی دُنبالہ دار آنکھوں میں پنہاں وسعتیں، حرکت کی تجلی، تڑپ اور بہادری کا جذبہ اور اُس کے بازوؤں میں اپنے محبوب کو پناہ دینے کی طاقت۔ ۔ ۔ ۔

محبوبہ شرما جاتی۔ اُس کے کُھردرے ہونٹوں پر دانت کی کالک انکھرنی شروع ہو جاتی۔ سفید موتی ایسے دانت تاج محل کے مرمر کو اپنی جلا کاری سے ماند کر دیتے۔ آنکھیں نیچے اُوپر دیکھتیں۔ اور پھر کچھ کچھ جھکی جھکی نگاہیں ایک عاشقِ نَو کی طرح بول اُٹھیں۔

"الوداع! الوداع اے میرے محبوب، میں دن بھر بیٹھی تیرا انتظار کرونگی اِن دیواروں، برگدوں، پیپل کے سائے میں تیرے بچے کھیلتے رہیں گے۔

پپلیاں چنیں گے۔ نیم کے پیڑ میں پھول آگئے ہیں۔ میں بنولیوں کی مالا بنا کر ان کے گلے میں پہنا دوں گی۔ تم جا رہے ہو میرے محبوب۔ میں پہاڑ کی دیوی سے دعا مانگوں گی کہ اس سے پہلے کہ نیلا آسمان بسنتی رنگ اختیار کرے تم مجھ کو اپنے دھڑکتے ہوئے سینے اور مضبوط بازوؤں میں پناہ دو۔ الوداع . . . . . . " اور اس طرح گھر پیدا ہو گیا۔

انسان قدرت سے دور بھاگنے لگا۔ اور قدرت تیزی کے ساتھ انسان سے جی چرانے لگی۔ نسل آدم چشموں سے گھبرائی، وادیوں کے گھناؤنے ماحول سے ڈرنے لگی۔ درختوں اور پرندوں سے ناطہ توڑا اور اس کے مضبوط ہاتھ پانی مٹی کو بری طرح سے تھوپنے لگے مٹی کی دیواریں، پھوس کے چھپّر، بانس کی کھپچیوں کے دروازے، آس پاس کیلے کے خودرو درخت، آزاد بیلیں جو وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ پھوس کے چھپّروں پر پیچ و تاب کھاتی پھیلنے لگیں۔ شفق کے پیلے رنگ کے ساتھ ساتھ مٹی کے دیئے کی ہلکی بھورے رنگ کی روشنی نے جھونپڑی کو منوّر کرنا شروع کر دیا۔ راہی کو منزل کی جستجو پریشان کرنے لگی۔ وہ تہذیب جو آزادی کے گہوارے میں جھولا جھولتی تھی منزل کی الجھن میں پڑ گئی۔ راہ گیر تھکے اور جھونپڑی کا سہارا ڈھونڈے رات سر پر آئے اور جھونپڑی چراغ کی مدہم روشنی میں جذب ہو جائے۔ پھر زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں دن کی محنت و مشقت کے بعد موسیقی کے سدا بہار وادی میں سکونِ قلب ڈھونڈے۔

"میں دن رات محنت کروں گا میرے گھر کی مالک، میں ایک بیلوں کی جوڑی خریدونگا اور تم ببول کے درختوں کی نرم نرم ٹہنیوں میں کوڑیاں پرو کر

اُن کے لئے ایک مالہ تیار کر دینا۔ اور اُن کی پنڈلیوں کے گرد بچھوے کی بیل،
سے بچھوے توڑ کر باندھ دینا۔ تب وہ اترا اترا کر چلیں گے۔ بچھوئے اپنی آواز
سے اُن پنڈلیوں کے گرد موسیقی جگا دیں گے۔ اور پھر؟...... پھر میں زمین
کا ٹکڑا صاف کر کے اناج کی کھیتی کروں گا۔ اور جب میرے کھیتوں میں دھان
اور گندم کی فصل تیار کھڑی ہو تو تم روٹھ جانا میں تم کو تحفہ دوں گا۔ چاندنی رات
ستاروں کی چھاؤں میں ہم تم دونوں بیٹھے کھیت کی رکھوالی کریں گے۔ میرے
گھر کی مالکہ تمہاری پیشانی کو چومنے کے لئے میں نے کئی رات چاند کو وادی کے
اس پار کنارے پر نیچے کی طرف آتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں دن رات محنت
کروں گا میرے گھر کی مالکہ......"

گھر بنا۔ مٹی گارے چونے سے بنی عمارتیں صدیوں کی بنیادوں پر قائم
ہونے لگیں۔ جھونپڑیاں، مٹی کی چھتیں، بھٹیوں میں پکی ہوئی اینٹیں، کرنی
بیسولی اور Plumb-line (وہ آلہ جو عموداً قائم رہتا ہے) کی مدد سے
جیتی جاگتی حویلیاں نمودار ہونے لگیں۔ اہرامِ مصر کے لئے تکونے پتھروں کو
رسیوں کے ذریعے کھینچنے والے پسینے اور تھکان کے اندر ڈوبے ہوئے غلاموں
کے غمگین نغمے، جمعداروں کے ان حبشی غلاموں کی ننگی کمر پر سڑا سڑ تلوار کی دھار
ایسے چرکے لگانے والے کوڑے...... اور نسلِ آدم کا ایک لامتناہی گروہ،
مصیبت کے راگ، ظلم و استبداد کی چکی میں پستے پستے آوازوں اور حرکتوں
کو برقرار رکھنے والا غلامی کا پٹہ پہنے ہوئے گروہِ عظیم۔ آدم کی اولاد مصر کے
صحرائی گرم ریت میں چند فرعونوں کی یاد تازہ کرنے کے لئے اپنی جان توڑ کر

عمارت کو ترقی دینے کی کوشش میں منہمک، اہرامِ مصر (Cheops)
یادگار، وہ ملک جس میں آئی سس (Isis) کے آنسو میں (ی [illegible])
انا نتوگرس) کے انتقام کی یاد تازہ ہے اور وہ اہرامِ مصر اب بھی خاموشی کے
ساتھ کھڑے رودِ نیل کو سنجیدہ نگاہ سے دیکھتے رہتے ہیں اور غلام مزدور، ظالم جمعداروں اور فرعونیت کے خونچکاں باب صدا بصحرا بن کر صفحۂ گیتی سے ہمیشہ کے لئے مٹ گئے ہیں۔

عمارتیں بنیں، دُنیا کا نظام نئے سانچے میں ڈھلنا شروع ہو گیا۔ یگانگت عنقا ہو چلی۔ قُدرت کی سرسبز وادی میں بدنظامی اور ابتری نے خزاں کے رنگوں کو بیدار کر دیا۔ ہری بھری سرسبز وادیاں انسان کے ہاتھوں بربادی کے غار میں غرق ہو گئیں۔

انسان نے قدرت کی گود میں مچلنا شروع کر دیا۔ اُس نے عمارتیں بنائیں گاؤں آباد کیے۔ عمارتیں بناتے بناتے اپنے آپ کو ٹکڑوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ یہ ہماری عمارت ہے، یہ ہمارا گاؤں ہے، یہ ہمارا قصبہ ہے، یہ ہمارا شہر ہے۔ ہمارا ملک، ہماری قوم . . . . ہماری عمارت میں ہوا پانی کا انتظام ٹھیک ہے، طوفانِ باد و باراں سے محفوظ ہے . . . . عمارتیں بنیں اُنہوں نے اپنی کھوکھنیوں کو آسمان کی طرف اونچا کر کے قہقہے لگانا شروع کر دیئے۔ آسمان۔ غلط! آسمان کے نیچے بھلا انسان کو حفاظت نصیب ہے۔ عمارتیں انسان کو گرد و غبار، باد و باراں، گرمی سردی سے پناہ دیتے ہیں آدمیوں کے بچے رات کے وقت خونخوار جانوروں اور زمانہ کی سرد و گرم ہوا سے محفوظ،

آرام کی تان کر عافیت کی آغوش میں محوِ خواب رہتے ہیں۔ اور صبح جب مہرِ عالمتاب کے آگ ایسے رُخساروں سے نکلنے والی شعاعیں دیواروں کی چھاتیوں سے زبردستی اپنے آپ کو رگڑنا شروع کر دیتی ہیں تو ننھے معصوم بچے اپنے اپنے بستر استراحت سے اُٹھ کر آنکھ ملتے ہوئے اپنے پیدا کرنے والوں کی طرف دیکھتے ہیں . . . . نیلا آسمان، ننگی اور آزاد قُدرت، دن بھر سمع خراشی کرنے والے آبشار، پہاڑ کی وادیوں میں رندانہ انداز میں چلنے والی الھڑ بے حیا ہوا، دُھوپ اور تمازتِ آفتاب سے مرجھا کر جان دینے والے نازک پھول، ہاہا ہی ہی ہو ہو . . . . اور قُدرت کے نکھرے اُجلے چہرے کو مکانات کی کھڑکیوں سے سر نکال منہ چڑانے والے بچے۔ صبح سے شام تک قُدرت کی آغوش میں بھی تھوڑی دیر ایک مستی اور کیف کا جھولا جھولنے کے بعد عمارتوں کی پناہ میں اپنا سر چُھپا لیتے۔

قرنِ اوّل - قرنِ دوئم - قرنِ وسطیٰ . . . . قرنِ موجودہ . . . . صدیوں کی بُنیاد عمارتوں کی بُنیاد ہے۔ بابل کے جھولتے ہوئے باغ جھولا جھولنے سے فراغت پا چکے ہیں۔ روما کے مندر اور مینارے اور عظیم الشان تماشہ گاہیں، زلزلے کی تباہ کاریاں اور پومپائی (Pompeii) کے آخری دن، ان کی یاد ابھی تک باقی ہے۔ لیکن شاید لارڈ لٹن کی پھول والی اندھی ساحرہ، مغنی ازل کی یاد ان عمارتوں سے زیادہ تازہ ہے۔ پومپائی کی عمارتوں نے سر اُونچا کیا اور وہ خدائی قہر کے نیچے دب گئیں۔ ان عمارتوں نے ویسیوس Vesuvius کے آگ اگلنے والے، اپنی روشن چھاتی میں نارِ جہنّم سنبھالنے والے آتش فشاں

پہاڑ کی یاد چھوڑی ہے - آتش فشاں پہاڑ شاید قدرت کا عاشق تھا اور شاید کسی اندھیری رات میں اُس نے رات کی دیوی کو آبشاروں، مرغزاروں، وادیوں کے دیوتاؤں کے ساتھ گفتگو کرتے سُن لیا تھا۔

"شیطانی قصور کی اتنی سزا، دُنیا کا باغ جنت باغ سے زیادہ سرسبز ہے۔ آخر انسان کیوں ہم سے دُور بھاگتا ہے - اور یہ عمارتیں . . . "

شاید اُس وقت ہوا نے غصہ کا اظہار کیا - وادی کی آوازیں - زہر خندہ میں مصروف ہو گئی ہوں گی - " یہ عمارتیں ہماری قوتوں سے ٹکر لیتی ہیں - "

قہقہہ کی آواز اور ویسیوس Vesuvius نے اپنی دوستی کا ثبوت دیا۔

دُنیا کی تاریخ عمارتوں اور قدرت کے درمیان جنگ و جدل کی تاریخ ہے۔ انسانی ہونا کیاں عمارتوں کی تلاش میں موسم گرما میں بدرُو میں سستانے والے کتوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ لڑتی ہیں - عمارت آہستہ آہستہ نوجوانی کی منزل میں قدم رکھنے والی انسانی تہذیب کا دُھندلا خواب، ہوس کا تختۂ مشق، ایک ملک دُوسرے ملک پر یلغار بولے کس واسطے ؟ غنیم کی عمارت کو اپنے قبضے میں لینے کے لئے - آج قلعہ مغلوب ہوا - آج کونسی دیوار زیر ہو گئی - قلعہ کا محاصرہ کنندوں کی نظریں عمارتوں کی طرف ہیں - آنکھیں للچائی سی، برجوں، میناروں اور قلعہ کے اندر پوشیدہ چونے، مٹی، مرمر کے ڈھانچے کو اپنے قابو میں کرنے کی موہوم اُمید - قلعے کے اندر مسکینوں کے چہروں پر ہوائیاں - اُمید و بیم کے قفس

و قزح کے مانند رنگ بدلنے والے گرسنہ چہرے، پژمردہ نگاہیں۔ اور باہر...
آزاد پرندے لہلہاتے ہوئے درخت، نیلا آسمان اور اُس کی لاابالی جھیل کے
معلق سائے میں عمارتوں کی قید سے بے نیاز طائر نغمہ زا، پہاڑیوں کا سلسلہ
اور وادیوں کی آوازیں جو دوسرے محاصرہ کنندگان اور گھرے ہوئے انسانوں
کی حالت پر کبھی کبھی مایوسی کے سورج کو سلسلہ ہائے کوہ پر جھکتے سمے غواہ مخواہ
ہنس اٹھتی ہیں۔ جب غنیم قلعے کو سر کر لیتا ہے تو وہ عمارت اس کو تھوڑے سے
عرصے کے لئے اپنے گھیرے میں مقیّد رکھتی ہے۔ اور پھر غنیم کے فاتح خیالات کو
پہاڑیوں کی پرلی اور بسنے والی عمارتوں کی طرف راغب کر دیتی ہے۔ عمارت وہ
مقناطیس ہے جو انسان کو بری طرح سے اپنی طرف کھینچتی رہی ہے، اور اس کے
اس اشتیاق کو ترقی دیتی رہی ہے۔ جس کی وجہ سے ایک کے بعد ایک وقت کی
بنیادوں پر کھڑی ہوئی عمارتوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ ایک عمارت پردۂ غیب
سے نمودار ہوتی ہے تو انسانی دماغ دوسری خیالاتی عمارت کو تشکیل دینا شروع
کر دیتا ہے۔ اس خیالاتی تشکیل کی ہر ایک کڑی عمارت کی ترقی کا ایک زینہ ہے۔
جو اس محبوب دنیا کو مٹی گارے کے گھروندے سے عروج کی طرف دھکیلنے کی
کوشش کرتا ہے...... آسمان کی نیلی بلندیوں کو چھونے کی فضول جستجو سیزر
نے روما کی عمارت کی بنیاد ڈالی چین نے ایک سینکڑوں میل لمبی دیوار کھڑی کر دی
اور ہمالیہ کے دامن میں بسنے والے وسطی ایشیا سے ہجرت کئے ہوئے انسانوں
نے اپنے دیوی دیوتاؤں کے لئے عالیشان مرمر و سنگ سرخ کے ڈھانچے
کھڑے کر دئے۔ ہمالیہ کی چوٹی اب بھی تعجب سے نیچے کی طرف جھکی جھکی سی ان

میدانوں کی طرف دیکھتی رہتی ہے۔ شاید اُسے اکثر تعجب ہوتا ہے کہ انسانی عمارتوں میں استحکام کیوں نہیں۔ ہمالیہ اٹل ہے جیسا کہ الپس (Alps) یا انڈیز (Andes) کی برفیلی چوٹیاں۔ لیکن عمارتوں نے تاریخ کے صفحوں کو اپنے اجسام بکھیر کر پلٹا ہے اور بکھر بکھر کر پھر بننے کی کوشش کی ہے۔ پل آدم، روما کے کھنڈرات، ڈائنا کا مندر، چین کی دیوار، ٹوٹتے ٹوٹتے بھی موسم کے حملوں، زمانہ کی اُلٹ پھیر سے اب بھی برسرِ پیکار ہیں۔ شاید انہوں نے اپنی رُوحانی عظمت و جلال کھو کر بھی اپنی تاریخی حیثیت اور اپنی عزت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ مگر؟ . . . . قُدرت برابر ہنسی جارہی ہو۔ اُسے اکثر انسانی کرتوتوں کی شکست پر ہنسی آجایا کرتی ہے۔ ہوا ریت کے ذرّات کو عمارتوں کے بوسیدہ پتھروں میں داخل کرکے اُن کے سینے اور جگر کو آہستہ آہستہ چھلنی کرنے میں مشغول رہتی ہے۔ طوفان بادو باراں میں گلے سڑے پتھر کھسک جاتے ہیں اور دریاؤں کے طوفان عمارتوں کی چھاتیوں سے خوب رگڑ رگڑ کر گلے ملتے ہیں۔ لیکن عمارتیں بے حیا ہیں وہ کوشش کرتی ہیں کہ جب تک اُن میں قوت کا ایک ہلکا سا جزو باقی ہے وہ ہوا اور پانی، طوفان اور دیگر دشمنوں سے اپنی زلیست کو برقرار رکھنے اور دُنیا کے ساحرانہ انداز سے کچھ دن اور لُطف اندوز ہو سکیں۔

عمارتوں نے بغاوت کی ہے، قُدرت سے لڑنے کی ٹھانی ہے۔ اُنھوں نے چیکے چُپکے بہترین دماغوں کو اپنے سینے میں پناہ دے کر آسمانی بلندیوں کی طرف اُٹھا دیا ہے۔ اُونچے اُونچے مینار جو مضبوطی سے زمین کی چھاتی

میں گڑ گئے اور پھر سیاروں، نظام فلکی، ستاروں اور دوسرے آسمانی جانداروں کو انسان نے دیکھنے کی کوشش کی۔ . . عمارت نے قدرت کا راز معلوم کرنے کے لئے اپنا سر اوپر اٹھایا تننا شروع کیا۔ آخر وہ ستاروں کے کھیل، ہوائی چیرہ دستیوں سے تنگ آچکی تھی۔ لیکن انسان کی عمارت سے یہ درستی بہت مہنگی پڑی۔ گلیلیو نے دوربین سے عمارت کے سر پہ چڑھ کر خدا اور غیب کے رازوں کو جاننا چاہا لیکن مذہبی ٹھیکیداروں نے اسے مجرم گردانا۔ روم کی عمارتیں جل رہی تھیں اور ان کی درد بھری آواز نیرو (Nero) سے رحم وکرم کی درخواست کر رہی تھی۔ لیکن نیرو فراغت اور لاپروائی کی بانسری کے ساتھ روما کے ہونے والے کھنڈرات سے بے نیاز اپنی تان میں مست، عمارتوں کو چڑا رہا تھا۔ ارشمیدس (Archimedes) نے اپنی عمارت اور اپنے فلسفہ سے اتنی دوستی گانٹھی کہ اسے یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ غنیم سر پہ آن پہونچا ہے۔ تباہی وبربادی کا منظر نار جہنم کے آتشیں خواب میں ڈوب جانا چاہتا ہے۔ انسان نے عمارتوں سے محبت کی ہے لیکن شاید عمارتیں انسان سے محبت نہیں کرتیں۔ شروع شروع میں یہ انسان کو اپنی آغوش میں پناہ دینے کے لئے کھینچتی ہیں پھر اس کو اپنے گھرے گھرے ماحول میں اتنا ناکارہ کر دیتی ہیں کہ انسان آزادی کا سانس لینا بھی بھول جاتا ہے۔ اس کا احساس غلامی کے گھٹنے ہوئے دائرے میں ہر دم دق وسل کے مریض کی طرح گھٹتا چلا جاتا ہے۔ عمارت قوموں کی اس غلامی کی بنیاد ہے جس جذبہ نے انسان کو تا قیامت جکڑ لیا ہے جب سے عمارتوں نے اس دنیا میں قدم رنجہ فرمایا ہے یہ انسانی غلامی بڑھتی

گئی ہے جتنی عمارتیں ہم پر غالب آتی جاتی ہیں تہذیب اپنے آپ کو اتنا ہی زیادہ تربیت یافتہ سمجھنے لگتی ہے اور اونچی عمارتوں کو غرور اپنا لیتا ہے۔ اُن کو قدرت کی آغوش میں پلنے والے زندگی کے بوجھ کو سنبھالنے والے سیدھے سادے، عمارتوں کی قید سے بے نیاز انسانوں پر رحم آتا ہے۔ یہ مانا اُن ہستیوں کو خدا دُنیا میں صرف اس واسطے دھکیل دیتا ہے کہ وہ ساری زندگی عمارتوں کے خواب دیکھتی رہیں۔ اُن کے دن بچوں کی طرح ان چونے، پتھر، گارے کے خوبصورت بیرونی نمائش والے ڈھانچے کو دیکھ کر تڑپ اُٹھیں اور اُن کے سوتے ہوئے جذبات کو ہلا ہلا کر بیدار کرتے رہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان بدقسمت، بے بس انسانوں کی تمنا اور شرمندہ تعبیر خواب شاید اتنے تکلیف دہ ثابت نہیں ہوتے جتنی کہ عمارتوں کی قید، جو چکی کے بڑے سنگ خارا کے وزنی پاٹ کی طرح تہذیب اور اس کے دلدادوں کی گردن میں زبردستی اٹکی رہتی ہے اور دن دُگنے رات چوگنے اضافے کو بخوشی تسلیم کرتی ہے۔ شاید تہذیب کو اس سنگِ خارا کے وزنی بوجھ کو سنبھالنے میں یک گونہ مسرت محسوس ہوتی ہے۔ اور روز افزوں بوجھ کے نیچے دبی دبی یہ مصنوعی خوشی بیرونی اطمینان کے ساتھ بھرتی، افترا پردازی، ریاکاری اور جعلسازی کی قوتوں کو اپناتی، قُدرت کے اُصولوں کو ایک سرے سے نظر انداز کرتی، بوجھ سے دبی ہوئی بیل گاڑی کے پہیوں کی طرح ایک مستی بھرے والہانہ انداز کے زیرِ اثر وقت کی سڑک پر آرام سے گامزن رہتی ہے۔ خوشی اور فراغت غلط مثالی، ایک ایسی محبت کا نتیجہ جو عاشق کے سر پر چڑھ کر ناچتی ہے۔ اُس کی زبان کو بند رکھتی ہے۔ اور خدا کی اس نعمت کو جو ہر انسان کو وراثت میں ملتی ہے چکناچور

کرتی رہی ہے ـــــ اس کی ضمیر و روح کی آواز، جو آزادی کے اس دور کی بازگشت ہے جب دنیا اپنے بچپنے میں چسر چسر کر رہی تھی۔

عمارتیں ہم کو غلامی کا سبق پڑھاتی ہیں۔ ہمارے احساسات کو پست اور محدود کر دیتی ہیں۔ مگر شاید ان کا ایک روشن پہلو بھی ہے ـ وہ یہ کہ گم کردہ شباب کی رمق، محبت و عشق کی لازوال نشانیاں، اور انسانی دماغ کی ترقی کا وہ نقشہ جو عمارتیں ہر زمانے میں اپنے فسردہ چہروں پر کندہ کر لیتی ہیں۔ ممتاز محل کو تاج کے مرمر نے ڈھانپ لیا ہے۔ تنِ فانی کے لئے اس سے زیادہ کونسی شاندار عمارت ہو سکتی ہے۔ تاج محل عمارتوں کی دنیا کے آسمان کا چمکتا ہوا ستارہ ہے سینکڑوں میل پرے کھڑی ہوئی عمارتیں تاج محل کو جھک کر آداب اور کورنش بجا لاتی ہیں۔ عمارتوں کو عمارتوں سے راہ ہے۔ سلیم کے کبوتر، کلوپطرہ کے عشوہ و ناز، حرم سرائیں اور چاندی کے محل، عیش و نشاط کی فانی گھڑیاں، یہ سب نظارے عمارتیں ہم کو وقت کے پردے پر پیش کرتی ہیں۔ عمارتیں ہم کو اُس گذرے ہوئے زمانے کی یاد دلاتی ہیں۔ جب اُن کے سائے میں عشق اور محبت کے فیصلے تلوار کے زور پر ہوتے تھے۔ ان کے کونے کھدروں میں عشق و نیاز کی پُر لطف گھاتیں وقت کے تاروں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر موسیقی کے دریا بہانا شروع کر دیتی تھیں۔ رات کی سیاہی دنیا کے عیب و ثواب ڈھانپ رہی ہے۔ گم کردہ مسافر عمارت میں جلتے ہوئے چراغ کی زیارت کے لئے مڑا جا رہا ہے۔ اور پھر وہی مسافر کسی چاندنی رات کو ان پتھر، گارے اور چونے سے بنی ہوئی عمارتوں کے سائے میں اپنی محبوبہ کو متوجہ کرنے کے لئے جنتی راگ چھیڑنے لگا۔ عمارتوں نے عشق

کو مجبور کیا کھڑکی کے ذریعہ اس کے دل کا راز آشکارا کیا بھیکی بھیکی چاندنی، کھڑکی پر ہلتا ہوا آنچل، متبسم مگر مسحور کن حُسن، لیکن عمارت درمیان میں حائل کن انکھیوں سے دل کی بھڑاس نکالی جارہی ہے۔ یہ مانا عشق عمارتوں کو کوستا تھا ان کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا مگر شاید یہ راز سوائے عمارتوں کے کسی اور کو معلوم نہیں کہ عمارتیں ہی محبوب کو عاشق سے جُدا کر دیتی ہیں اور یہ ہی اس کشمکش کا باعث ہیں۔ جو اکثر شب ہجراں میں تاروں کی چھاؤں میں عمارتوں کی چار دیواری میں قید بندگانِ محبت کو ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپا تڑپا کر غم و یاس کی تاریک اور ڈراونی تنگنائے میں دھکیل دیتے ہیں۔ عمارت عشق کا ذریعہ ہے اُس کی منزل تک پہونچنے کے لئے غیر یقینی فاصلے کی ایک کڑی ہے۔

اگر عمارت نہ ہوتی تو پھر عشق کیوں قرنِ وسطیٰ یا اس سے پہلے اور بعد شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں، رومیو جولیٹ جیسے نمونوں کو صفحۂ گیتی پر تڑپنے اور عشق کی روایات قائم کرنے کے لئے بھیجتا۔ عمارتوں نے اُن کی کہانی میں عدیم المثال کردار نگاری پیش کی ہے۔ اگر یہ اُن کے شاملِ حال نہ ہوتیں تو شاید دُنیا کو ان ہستیوں سے محروم رہنا پڑتا۔ عمارتوں کے چکنے مرمریں دل کی دھڑکنوں کے چلتے پھرتے سائے ہیں جو کہیں کہیں رُعبِ حُسن سے بت گئے ہیں۔ ان میں مغنیِ ازل کے اُن نغموں کی گونج ہے جو اُس نے دُنیا کے موسیقاروں میں پھونک دی تھی۔ فردوسی، سعدی، تلسی داس، گوئٹے، ڈانٹے، شیکسپیر۔ ان سب کو عمارتیں سنبھالتی ہیں، اُنہوں نے ان کی آواز کو ترقی دی ہے اور دُنیا کے کونے کونے میں بکھیر دیا ہے۔ شاعر کی آواز عمارتوں کی آواز ہے اُس آواز کی بازگشت جو صدیوں کے

پھیلاؤ میں عالیشان محلات، مندروں، مسجدوں، گرجاؤں میں یگانگت کے راگوں کو زندگی کے ساز پر چھیڑتی رہی ہے۔ اسی آواز کی گونج اب بھی اُن عمارتوں میں گونجتی ہے، کتنی خلوص و صفا کی حامل ہے وہ آواز لیکن شاید... شاید انسان اُسے سمجھنے سے قاصر ہے۔ جب عمارتیں چلاتی ہیں ہم نے زمانے کے انقلاب دیکھے ہیں۔ عقل کی جنت، تہذیب کے رنگین خواب میں سُرخ ندیوں کو بہتے ہوئے دیکھ کر سرد آہیں کھینچی ہیں۔ لیکن انسان نہیں سُن پاتا۔ عمارتیں کہتی ہیں ہم مجبور ہیں۔ ہماری آوازیں صدا بصحرا بن چکی ہیں۔ زمانہ گذرتا ہے عمارتوں کی زندگی میں دو چار دن کا اضافہ اور ہو جاتا ہے۔ اور پھر بھوکی، ستائی ہوئی انسانیت عمارتوں کی طرف گرسنہ آنکھوں سے دیکھتی ہے۔ شاید وہ ماضی کے زمانہ کو کھود کھود کر کسی گم شدہ ہیرے کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ ماضی کے سبق، مستقبل کی اُمیدیں عمارتوں سے وابستہ ہیں۔ عمارتوں نے انسانی دماغ کے تنزل اور ترقی سے برابر دوستی روا رکھی ہے۔ قرنِ وسطیٰ میں عمارتوں کی دُلہن کو ہر مرسے سجایا گیا نقش و نگار سے مرصع کیا گیا۔ اعلیٰ خوبصورتی کے نمونوں کی روح کو بے جان عمارتوں کے ڈھانچوں میں پھونک دیا۔ ازمنہ وسطیٰ میں موجودہ طرز تعمیر کا بندوبست نہ تھا مگر شاید عمارتوں سے لگاؤ نے انسانی ہاتھوں میں خوبصورتی کا جادو بھر دیا۔ انسان نے عمارت کی ہر ادا پر جان نثار کر دی۔ اُسکی دُلہن کو شبانہ روز کی محنت سے آراستہ و پیراستہ کیا۔ عمارت کے عشق میں انسان نے جور و ظلم سہے ہیں کڑوی کڑوی باتوں کو سُنا ہے۔ لیکن اس نے اس سنگ خارہ کی چکی کو اپنی گردن میں لٹکانے کے لئے بڑی بڑی قربانیاں

دبی ہیں۔ بہت سے معماروں کی رُو میں اب بھی ان عمارتوں کے مٹی گارے کے نیچے دبی ہوئی اپنی لازوال محبت اور عدیم المثال ایثار کی آواز کو ہر سانس لینے والے جاندار کے کانوں میں گذار دینا چاہتی ہیں ۔۔۔۔ اُونچی اونچی عمارتیں بن رہی ہیں۔ ہزاروں مزدور دن رات محنت سے جان توڑ کر کام میں کوشاں۔ ہوا کا ایک غیر موافق جھونکا، آندھی اور طوفان سر پر منڈلا رہا ہے۔ پاڑ کی بلّیاں ہل رہی ہیں سراسر مضطرب ۔۔۔۔ لیکن عمارتوں کی محبت ساتھ نہیں چھوڑتی ۔۔۔۔۔ قیامت کا منظر ٹوٹی ہوئی بلّیوں کے پاس درد بھری آوازیں' بیوہ عورتیں روتی ہوئی، درد و کرب کی ایک غیر منتہائی داستان ۔۔۔۔ مگر طوفان کے گذر جانے کے بعد کام برابر جاری، وہی مشغولیت، وہی توجّہ، وہی محبت اور ریاضت ۔۔۔۔۔ انسان عمارت کو تباہ و برباد دیکھتے ہوئے رویا ہے۔ اس کو پھلتا پھولتا دیکھ کر خوش ہوا ہے۔ عجب! وہ چیز جو ہمارے جذبات، ہمارے خیالات کو گھونٹ کر رکھ دیتی ہے ہم اس سے محبت روا رکھتے ہیں۔ یہ عمارتوں ہی کا طرۂ امتیاز ہے۔

عمارتوں کی بُنیاد قوموں کی بُنیاد ہے۔ قوموں کی بُنیاد تہذیب کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ اسی واسطے عمارتوں کی طرز ادا دیکھ دیکھ کر گوتم ایسے انسانوں کا دل بیٹھ گیا۔ اور نہ جانے کن کن بندگانِ خدا نے ویرانگی اختیار کی۔ عمارتوں نے اب نئے انداز، نئے ڈھنگ سیکھ لئے ہیں۔ یہ اب چونے اور گارے کی محتاج نہیں۔ فسطائیت، نازی ازم، جمہوریت ۔۔۔ نہ جانے کون کونسی عمارتیں وجود میں آگئی ہیں۔

آجکل عمارتیں تضاد پر جیتی ہیں - ایک انسان کو دوسرے انسان سے جدا کرنے میں امتیازی درجہ حاصل کر چکی ہیں - لیکن پھر وہی سوال وہی اُلٹ پھیر - انسان عمارتوں سے محبت کئے جاتا ہے - زیادہ شدّت کے ساتھ عمارتوں کی محبت میں محو ہو گیا ہے - اس عشق نے تہذیب کے کانوں کو گونگا کر دیا ہے - ہمارے جذبات کی آزاد پرواز کاٹ دی ہے - عجب! ہم عمارتوں کے سہارے جیتے ہیں، ہر روز نئی عمارتوں کی تشکیل میں کوشاں ہیں - یا خدا! یا رحیم! یا پرماتما! ان عمارتوں کی درستی کتنی مہنگی ہے - عمارتیں وہ سم قاتل ہیں جو انسان کے تمام اوصاف حمیدہ اور ستھری صفات کو موت کی وادی میں دھکیل دیتی ہیں - عمارتیں خودغرضی میں حاسد ہیں لیکن نسل آدم یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ عمارتیں ساری مصیبتوں کی جڑ ہیں - اُن سے محبت کئے جاتی ہے - اُنکی قدر کرتی ہے - اُن پر مر مٹنے سے دریغ نہیں کرتی اور؟ اور قدرت ہنس رہی ہے - مکرر متواتر - صدیوں سے اس قہقہے میں مصروف ہے جسکا باعث انسانی تہذیب کی جاہلانہ خودغرضی اور خودستائی ہے - جو عمارتوں نے اُسے سکھاوی ہے -

عمارتیں باطل کی شکست نہیں بن سکتیں - قُدرت کے قانون نہیں توڑ سکتیں - وہ فانی ہیں اُن کی فسردہ پیشانی پر غمگین لفظوں میں مدّت سے لکھا جا چکا ہے -

"اے مخلوق! تو ان عمارتوں سے کیوں مسحور ہو چلی ہے عمارتوں کی بنیاد انسانی غلامی کی بنیاد ہے یہ انسانی ترقی میں رکاوٹیں ہیں اور ......" لیکن ہم اس غمگین عبارت کو نہیں پڑھ سکتے شام ڈھلے عمارتیں ہمکو پکارتی ہیں، ہم مجبور ہو جاتے ہیں - یہ عمارتیں چپکے چپکے کبھی چوتھائی گذرے کبھی آدھی رات گئے اُس انسانی غلامی کا تذکرہ کرتی رہتی ہیں جو عمارتوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ مضبوط سے مضبوط تر ہوئے جا رہی ہے -

"ساقی" اگست ۱۹۴۲ء

فرید آباد کی مینہارن

تڑکے تڑکے مُرغ کی بے ہنگم ککڑ کوں کوں نے نوری کے خواب کو منتشر کردیا۔ اُس نے لیٹے لیٹے دو تین کروٹیں سی لیں۔ ہاتھوں سے غیر ارادی طور سے بالوں میں گھسے ہوئے ریت کے ذرّوں کو جھاڑا۔ اور پھر بسم اللہ کہہ کر وہ اپنی کھاٹ پر آنکھ ملتی سی بیٹھ گئی۔ انگیا میلی پڑ چلی تھی۔ دوپٹہ بھی کچھ گھس سا گیا تھا۔ اور رات سوتے وقت آنکھوں میں لگایا ہوا کاجل کچھ پھیل سا گیا تھا۔ آنکھ ملتے ملنے کاجل اس کے رُخساروں، ناک، پیشانی تک پر پھیل گیا۔ "یا اللہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔!"
اس نے گھبرا کر مُرغ کی متواتر ککڑ کوں کا جواب دیا۔ کاجل کی لکیریں تھیں اور ریت

کے ہلکے ہلکے ذرے جو آس پاس سے صبح کی ہلکی سی ہوا میں اڑکر اُس کے رخساروں پر جم گئے تھے، اُس کے حُسن کو چھپا نہیں سکتے تھے جس میں پکتے ہوئے آم ایسی ملاحت تھی - ایک فطرتی خوبصورتی رجحان سا جو ہر منزل میں خیالات کے ذریعہ نکھرتا ہے۔

نوری مینہارن سنبھلی اور اپنے لباس کو درست کرتی ہوئی کھڑی ہوگئی - زمین پر بچھی ہوئی ریت قدرے سرد تھی - مگر اُسے اس سرد ریت پر بیباک قدم رکھنے کی عادت پڑگئی تھی - اُس کی نگاہ ایک دم اُس ڈربے کی طرف پڑی جس میں مُرغا ککڑوں کوں کہہ رہا تھا اور بید کا ٹوکرا جس کے نیچے مُرغی اپنے پانچ چھ نرم نرم روئیں والے بچوں کو سمیٹ سماٹ کر خاموش بیٹھی تھی ڈربے سے آزاد ہو کر مُرغا اُڑ کر نوری کے چھپر کی چھت پر بیٹھ گیا - اور مُرغی کے بچے اپنی ماں کے ساتھ ساتھ اِدھر اُدھر چیں چیں کرتے دانہ دُنکا چُننے میں مشغول ہو گئے۔

نوری کے لئے ایک اور صبح جاگ چکی تھی تنہا نوری کے لئے جو ہر روز نت نئی رنگین چوڑیاں پہنتی تھی - اُسے قوس و قزح کے رنگ بہت پسند تھے - وہ دن بھر بھٹی پر بیٹھی کانچ، لاکھ کی چوڑیاں پٹھے کرکے تیار کرتی رہتی تھی - بھٹی کی آگ کا رنگ اس کے رُخساروں ایسا شہابی پڑ جاتا تھا - اور دھونکنی پھونکتے پھونکتے نوری کے چہرے پر گلاب کے پھول کھلنے لگتے تھے - کان کی لو آتشی پڑ جاتی تھی - اور پیشانی کی بوندیں کھسک کر زمین میں جذب ہو جاتی تھیں - تیرہ برس کی عمر میں نوری تنہا اس زندگی کے بوجھ کو سنبھالنے کے لئے گھر میں اکیلی بچ سکی تھی جو اکثر یتیم اولاد کو سنبھالنا پڑتا ہے - مگر نوری یتیم ہوتے ہوئے کسی کی محتاج نہیں تھی - اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا چوڑیاں بنتے دیکھی تھیں - اور اب وہ ہر قسم کی چوڑیاں تیار

کر سکتی تھی۔ دن بھر کسی نہ کسی کام میں مشغول رہتی تھی۔ کھانا پکایا۔ مُرغی کے آگے دانہ ڈالا۔ بھٹی میں آگ سلگائی اور چوڑیاں بنانے کا سامان تیار کیا۔ لاکھ پکی کانچ چوڑیاں ناپنے کا ڈنڈا۔ چمڑا۔ سریش۔ جس کے ذریعہ وہ لاکھ کی رنگ برنگی چاک ایسی لمبی لمبی ڈلیوں کو ایک ڈنڈے کے سرے پر چپکا چپکا کر بھٹی کی آگ پر سینک کر پگھلاتی رہتی تھی۔ اور پھر پگھلی ہوئی لاکھ سے تار سا کھینچ کر، ڈنڈے کے گرد لپٹا کر وہ نازک نازک چوڑیاں تیار کرتی رہتی تھی۔ آس پاس میں۔ محلّہ میں، بلکہ سارے قصبہ میں اس کی چوڑیوں کو عورتیں لڑکیاں، جوان بوڑھی سب ہی تو بڑے چاؤ سے پہنتی تھیں۔

انوری! نئی شادی شدہ لڑکی جو اکثر دو تین دفعہ سسرال اور میکے کا چکر سا کاٹ چکی ہو۔ اور گود میں چُسر چُسر کرنے والا بچہ موجود . . . . نہایت ملائمت سے کہتی، نوری، ارے تیرا بیاہ نہیں ہوا۔ نواب اتنی بڑی ہو گئی ہے۔"

"جانے بھی دیجئے"۔ نوری اپنے گاہک کی گود سے بچے کو اپنی گود میں منتقل کر لیتی اور چمکارنے لگتی۔ اُسے بچے بہت پسند تھے اور وہ اکثر بچہ والی ماؤں کی سیندور بھری مانگ کو دیکھتی رہتی تھی۔ اکثر وہ اُن کے نازک ملائم گول گول ہاتھوں میں ہلکی ہلکی چوڑیاں ڈال دیتی۔

"بی نوری! بچہ کی چوڑیوں کا کیا ہوا مول؟"

"ارے، بچوں کی چوڑیوں کا بھی کوئی مول ہوتا ہے۔ ننھّے ننھّے ہاتھوں میں کتنی عمدہ معلوم ہوتی ہیں یہ چوڑیاں، نوری کے چہرے پر تبسم سا دوڑ جاتا۔ ایک مامتا سی جاگ جاتی۔ اسے ہر ننھّے خُردسال بچے سے محبّت تھی۔ نوری سے ہر ایک لڑکی خوش تھی۔ اُنہیں اس کی چوڑیوں کے رنگ اور بناوٹ بہت

پسند تھی۔ بھلا اسے کام بھی کیا تھا دن بھر بھٹّی کے سہارے چوڑیاں تیار کرنا، مُرغی اور اس کے بچوں کو دانہ دُنکا چُننے کے لئے بکھیر دینا۔

ایک ٹوٹے پھوٹے شیشے کے سامنے چہرہ دیکھ کر مانگ نکالنا۔ سرسوں کے تیل کی ایک ننّھی سی جا دینا۔ اور پُرانے وضع کے پاندان سے دن میں بھٹّی پھونکتے پھونکتے پان بنا کر چباتے رہنا۔ وہ نہایت خوبصورت تھی اور اُسے ننّھے بچوں سے پیار تھا۔ وہ اکثر راتوں ننّھی ننّھی چوڑیوں کے نئے نئے رنگ، تجویز کرتی رہتی تھی۔ بچوں کے خواب سُرخ و سفید بچے۔ نرم و نازک گلاب ایسے رُخسار۔ ہلکی ہلکی ناک۔ بھورے بھورے بال اور وہ اکثر تکیہ کو کلیجے سے لگا لگا لیتی۔

لیکن وہ بھی ایک عجیب لڑکی تھی۔ خدا نے اسے عجیب عجیب باتیں سکھا دی تھیں۔ عجیب یا پھر قابلِ تعریف۔ وہ اس گھر کو نہیں چھوڑنا چاہتی تھی، جس گھر میں وہ پلی تھی۔ وہ بھٹّی وہ چھپر، وہ مُرغی اور اُس کے بچے۔ . . . . . اسے نا معلوم غیر ارادی طور سے ایک احساس سا پیدا ہو گیا تھا کہ وہ اپنے آبا و اجداد کی یاد کو تب تک جب تک اس کے ہاتھوں میں دَم ہے اس جھونپڑی اور بھٹی کے سہارے سلامت رکھے۔ خالق کی عجیب مخلوق . . . . کنواری، نئی نئی بیاہی لڑکیاں اُس سے پوچھتی پوچھتی تھک جاتیں۔ "نوری تیرا بیاہ ہو گیا۔ نوری بی نوری شادی کر لو، مگر نوری سب ان سُنا کر دیتی۔ وہ ان خیالات کے ڈھیر پر بیٹھ کر اُس بھٹی اس جھونپڑی پر حکومت کرنا چاہتی تھی جو عمر کی ترقی کے ساتھ ساتھ زیادہ پختہ ہوتے جا رہے تھے بھٹی پر کام کرتے کرتے اور دن بھر اور دوسرے

کاموں میں لگے رہنے سے اس کے اعضا سڈول ہو گئے تھے ہاتھوں اور پنڈلیوں میں خون جھلکتا۔ ایک عجیب قسم کی سرخی سی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اکثر شریر لڑکیاں چوڑیوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کی نوکوں کو اُس کے بازوؤں میں چبھا دیتی تھیں تو اس کے بازو سے سرخ سرخ خون کی بوندیں سی نکل پڑتی تھیں۔ مگر نوری چُوں بھی نہ کرتی۔ اس شرارت کے بہانے وہ کم از کم اُن لڑکیوں، نئی شادی شدہ دُلہنوں سے گفتگو تو کر سکتی تھی۔ ورنہ اس کی زندگی اجیرن بن سکتی تھی۔ اور وہ کیسے تنہا اکیلی جھونپڑی میں اس شمع کو روشن رکھ سکتی تھی جس کو اس نے اپنے ننھے سے دل میں بچپن کے پاکیزہ ماحول میں روشن کیا تھا۔ اور اب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اکثر اڑوس پڑوس کی عورتیں ادھیڑ عمر اور بوڑھی کان میں انگلی دبا کر کہتیں۔ "اللہ! اکیس برس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اکیس" گویا وہ آٹھ برس سے زمانے کے حوادث کو تن تنہا سہتی رہی تھی۔ اور آئینے کی طرح صاف شفّاف تھی۔ چٹانیں سینکڑوں کی تعداد میں موجود تھیں اور نوری کا شیشہ کس لمحہ ٹکرا سکتا تھا کسی لمحہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وقت کے کسی بعید از قیاس ننھے سے ٹکڑے میں۔ مگر وہ آسمان تلے جھاگ اُٹھانے والا سمندر تھی جو اپنے تھپیڑوں کو چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش کر سکتی تھی اس کے ہاتھ بھٹی پر کام کرتے کرتے اور دیگر ریاضت میں مشغول رہنے کی وجہ سے نہایت مضبوط ہو گئے تھے۔ اور ہر ایک بد تمیز انسان کا بڑے آرام سے مقابلہ کر سکتی تھی ان کے کلّے چیر کر رکھ سکتی تھی۔ عجیب ضدوں کی ٹکر تھی نوری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ساری زندگی مجرد رہنے کا خیال اور بچّوں سے محبت۔

شاید نوری کی دو شخصیتیں تھیں۔ ایک بھٹّی کے کنارے کام کرنے والی

سخت ریاضت سے تنگ نہ آجانے والی منہارن، دوسری وہ نوری جو رات کو پلنگ پر اکثر ہاتھوں میں مہندی رچاکر سوتی تھی اور سویرے جب فرید آباد کی نوجوان لڑکیاں ادھر سے گذرتی تھیں تو وہ ان کو بلا بلا کر اپنے رچے ہوئے ہاتھوں کو دکھاتی تھی۔ "دیکھو بی! دیکھو کیسے ہاتھ اچھے ہیں میرے"۔

"ہاں بی نوری! بس اب تو تم دُلہن بن گئی۔ شادی کی تیاریاں کرلو۔ شام چڑھے برات آئے۔ نکاح ہو چھوارے بٹیں۔ اور پھر تم اپنا جھاڑ جھونپڑہ سنبھال کر دوسرے گھر چلی جاؤ۔ ایں نا! بی نوری"۔

"چلو ہٹو بھی! کیا باتیں کرتی ہو سویرے سویرے میری مہندی کیسی رچی ہو۔ پہلے یہ بتاؤ؟"

"بہت اچھی۔ کتنے پیارے ہاتھ ہو گئے تمہارے .... سگھڑ بہو ایسے"۔

"دُت!!"

بس بہو کے نام سے ہی نوری کو چڑ تھی۔ وہ ایک دیوار سے ٹکرانا بھی نہیں چاہتی تھی اور اس دیوار کے عقب میں کھلکھلاتی ہوئی زندگی کا مشاہدہ بھی کرنا چاہتی تھی۔ شاید وہ قدرت کے قانون کے مطابق عمل پیرا ہونا پسند کرتی تھی۔ بچہ اور شادی نہ ہونے پر بھی بچہ ..... عجب خیالات۔ کوئی کنٹرول کی نہیں ہوں میں سے تو وہ کسی بچہ کو اُٹھا کر لا ہی نہیں سکتی تھی اور ایک روز جب نوری بھٹی کے سہارے آگ میں پھونک مارتے مارتے اپنے کلوں کو پھلا پھلا کر سرخ کر رہی تھی تو ایک ادھیڑ عمر عورت اُس کی رہائش گاہ میں داخل ہوئی۔

"بی نوری سلام"
"سلام بی بی کیا کام ہے ؟"
"بہو کے بچہ ہوا ہے - آج سوبڑ نکلی ہے چوڑی پہنانے کے واسطے بلانے آئی ہوں"
"ابھی لو بی"۔

نوری نے مُرغی اور اس کے ننھے پیدا شدہ بچوں کو اکثر تین چار مہینہ کے بعد دس بارہ کی تعداد میں انڈوں سے خواہ مخواہ نکل آتے تھے، ایک بیت کے ٹوکرے کے نیچے ڈھک دیا۔ بھٹی میں جلتی ہوئی لال بھبوکا آگ کو سرد کیا۔ اور دروازے سے گول تالہ لگا وہ چوڑیوں کے مختلف اقسام کے جوڑوں کو لے کر اوھیڑ عمر عورت کے ساتھ چلدی۔ نوری اپنے ساتھ زیادہ تان تو بڑہ سنبھال کر نہیں لے جاتی تھی بلکہ وہ ہر ایک گھر کی پسندیدہ قسموں سے واقف تھی۔

ڈیوڑھی میں گھسی۔ دہلیز میں بیٹھنے کے لئے کہا گیا۔ بی نوری ایک مونڈھے پر بیٹھ گئیں۔ مردانے کی آوازیں اُس دہلیز میں کبھی کبھی سُنائی پڑ سکتی تھیں۔

"کیوں اما۔ اب تو ایک لڑکے کے باپ بن گئے تا بہئی کماں کر دیا"۔

"جانے بھی دو۔ کیا دُنیا میں بال بچے پیدا نہیں ہوتے ؟ شادی ہوتی ہو بال بچے پیدا ہوتے ہیں اور ـــ تمام جھگڑے بکھیڑے"۔

نوری انتظار کر رہی تھی اس نے سوچا کہ شادی پہلے ہوتی ہے پھر بال بچے پیدا ہوتے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے۔ وہ عجیب پیچیدہ اُلجھنوں میں مبتلا ہو گئی۔ شادی بیاہ کی کیا ضرورت۔ کیا اس نے تنہا درختوں پر بور لگتے نہیں

دیکھا۔ پھول لگتا ہے۔ بور آتا ہے اور پھل ..... درختوں کی شادی نہیں ہوتی اور پھر ان کی نرم نازک ٹہنیوں پر پھل لگتے ہیں۔ درخت جہاں کھڑا ہو جاتا ہے وہیں پھلتا پھولتا ہے۔ وہ اُس جگہ سے دوسری جگہ جانے کا نام نہیں لیتا وہ بھی جس جگہ پیدا ہوئی اسی جگہ پھلے گی پھولے گی۔ شادی اور بچے قُدرت کا ایک لاینحل مسئلہ اس کے سامنے درپیش تھا۔ کیا بغیر شادی کے بچے پیدا نہیں ہوتے ..... اس نے اکثر عورتوں کو کہتے سُنا تھا: بھگوان کے گھر سے آیا ہے۔ ... پرماتما کی کرپا ..... اللہ میاں کی دین ہے بہن" تو پھر شادی کا بچے سے کیا تعلق ..... دُت !! یہ لڑکیاں بھی نری بیوقوف ہوتی ہیں۔ دن نکلتا ہے رات آتی ہے اور پھر دن۔ لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں جوان بنتی ہیں پھر خدا ان کو چھاتیاں بھر بھر کر دودھ دیتا ہے۔ اور پھر بچے ..... اتنے باجے گاجے کی کیا ضرورت شادی! خواہ نخواہ ایک مصیبت مول لینا۔ وہ سوچتی جا رہی تھی اور چوڑیوں کو اپنے ہاتھ میں ترتیب دے رہی تھی اسے ہر ایک گھر کی بہو کے ہاتھ کا ناپ معلوم تھا ..... شادی، بہو، بچے ..... نوری اس سلسلے کو سمجھنے میں منہمک ہو گئی۔

" بی نوری، بہو کو بخار آگیا ہے۔ ذرا سو گئی ہے۔ دن ڈھلے آجانا اچھا!"

" ہاں جی"۔

" اے لو!" نوری نے دل ہی دل میں کہا شادی بچے اور بخار ..... کتنی مصیبت ہے تایا بابا نا"۔ اس نے اپنے بنچے کو ہلاتے ہوئے کہا۔ وہ کبھی

شادی نہ کرے گی۔ کیوں مصیبت مول لے۔ بخار ـــ بہو ـــ جانے کیا کیا؟

نوری بڑی ہوتی جا رہی تھی اور اس کے خیالات نا معلوم گھاٹیوں میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔ دن گزر رہے نوری کی جوانی پر نیا قوام چڑھتا۔ بازو سڈول پنڈلیاں گدرائی گدرائی ...... آنکھوں میں خمار اور رخسارے پر گلاب کا پھول ...... ننھی ننھی لڑکیاں اس کے پلّے کو اس کے ہی چہرے پر کھینچ کر اس سے آنکھ مچولی کھیلتیں اور جب بی نوری بھٹی پر آگ پر پھونکتی تو اکثر دس دس گیارہ گیارہ سالہ لڑکیاں مل بیٹھ کر گفتگو کرتیں۔

"نوری کا بیاہ ہو جائے گا۔ تو نوری اس قصبے میں تھوڑے ہی رہے گی۔ اور ہم کو کون اچھی اچھی چوڑیاں پہنائے گا"

"تیری بہن کی بھی تو شادی ہو گئی ہے ہر ایک بڑی لڑکی کی شادی ہو جاتی ہے پگلی"

"اونہہ ہوں، بی نوری کہتی ہیں کہ شادی کی کیا ضرورت ـــ واہ جی شادی تو ضرور ہوتی ہے"

"اور پھر ....؟"

اور پھر جب ایک روز ان ننھی لڑکیوں سے ایک نے دوسری سے کہا۔

"بہنا شادی کے بعد ننھے ننھے بچے ہوتے ہیں پیدا" تو نوری ایک دم اپنی بھٹی سے اٹھ کر ان کی طرف دوڑی۔

"دھت!! چلو یہاں سے کیا کیا باتیں بناتی ہو۔ ابھی تو ڈیڑھ بالشت کا قد ہے تمہارا اور جب تم پندرہ اور سولہ کے پالے میں آؤ گی تو نا معلوم کیا کیا

غضب کی باتیں کہو گی!!

آخر کب تک نوری اپنے خیالات کو ایک ہی شاہراہ پر گامزن رہنے دیتی۔ شادی اور بچے۔۔۔۔ محض اڑوس پڑوس، محلّے کی عورتیں نہیں کہتیں۔ بلکہ لڑکیاں تک بھی اس بات سے واقف ہیں کہ شادی کے بعد ہی بچے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک دُھند سی چھا جاتی۔ ساری عمر کی جنسی تنہائی نے نامعلوم کون کون سے خیالات اس کے غیر ترقی یافتہ دماغ میں گھسیڑ دیئے تھے۔ اور وہ اکیلی اپنی زندگی کی گاڑی کو لڑھکائے چلی جاتی تھی۔ اُسے رفتہ رفتہ اس بات کا احساس ہوتا جا رہا تھا کہ شادی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ کوئی چیز۔۔۔ اور وہ یہ کہ ایک نہایت ضروری چیز ہے۔ مگر پھر وہی خیالات اس کے دماغ پر چھا جاتے کیا درختوں پر بور نہیں آتے۔۔۔۔ اور جب وہ اپنی نو پیدا شدہ بلکہ کافی ترقی یافتہ جھلکتی ہوئی چھاتیوں کی طرف دیکھتی تھی تو اُسے درخت اور بور کا خیال آ جاتا۔ اور چُسر چُسر کرتا ہوا بچہ اس کے تصور میں ان چھاتیوں سے لٹک لٹک کر دودھ کھینچ کھینچ کر پینے لگتا۔ اُچ! اُچ!! اکثر اس کے گھر اور بھٹی کے نزدیک سے گذرنے والی لڑکیاں اور عورتیں اسے کسی خیالی بچہ کو پیار کرتے ہوئے دیکھتیں "پُچ! اُچ!! بیٹا روُ منت۔ بیٹا" نوری کی خیالی مامتا بڑھنے لگی۔ اس کا جذبہ ترقی پر تھا۔ ماں! جس کے قدموں میں محبت کا سرچشمہ ہے جہاں سے ایک ایسا دریا بہتا ہے جو دنیا کے کھیتوں کو سرسبز رکھتا ہے۔

ماں! ماں!! ماں!!! نوری کی چوڑیاں اکثر بجتے بجتے اس سے پکار کر کہتی تھیں۔ ماں! اور وہ اکیس برس کی ہونے کو آئی نوری اکیس برس کی ہو گئی محلّہ

اڑوس پڑوس کی عورتیں کان میں انگلی دبا کر کہتیں "اللہ اکیلی لڑکی ہے نا معلوم اللہ اس کا کیا بنے گا"

"کیا بنے گا؟" نیم کی ٹہنیوں نے بور کے موسم میں کہا۔ نیم کا درخت سفید پھولوں سے لدسا گیا تھا۔ اس کی ہری ہری ٹہنیاں نوری کی چھت کے اوپر ہلتی تھیں۔ بور پھول اور ہری ہری بنولیاں۔ بنولیاں ۔۔۔۔۔۔ اور نوری اپنی لٹکتی ہوئی پستانوں کی طرف دیکھتی۔ درخت میں بور آگیا ہے۔ بنولیاں نہیں آتیں۔ پھول لگ گیا ہے ضرور پھل آئے گا۔ نوری کو اُمید بندھ چلی تھی وہ نہایت خوش تھی۔ اس نے ننھے ننھے کپڑے بنانے شروع کر دئے۔ کرتے۔ قمیض۔ ستنے۔ اور نازک قوس و قزح کے رنگ کی چوڑیاں۔ اور وہ سویرے جب مُرغ گگڑ گوں گگڑ گوں کر کے اس کے خواب کو جگا دیتا تھا نیلے آسمان کی خوش نما لاابالی جھیل کی طرف ہاتھ اُٹھا کر کچھ دُعا سی مانگتی رہتی تھی۔ اس نے سُنا تھا کہ بچے خدا کی دین ہیں۔ بھگوان کی مرضی ۔۔۔۔۔۔ اور پھر وہ منٹوں نیم کے درخت پر گچھوں میں لٹکنے والی بنولیوں کی طرف دیکھتی رہتی۔

اب نوری کا زیادہ وقت اپنے خیالی ننھے بچے کے کپڑے بنانے میں صرف ہونے لگا۔

"نوری! نوری!!" ننھی ننھی لڑکیاں دوشیزائیں، ادھیڑ عمر گاہک عورتیں اس سے پوچھتیں:۔

"نوری۔ کون سے رشتہ دار کے بچے کے کپڑے سی رہی ہو؟"

"ارے کس کے، اپنا اس دنیا میں کوئی رشتہ دار بھی ہو۔ میں اپنے ہی ۔۔"

" ارے اپنے بچے کے لئے"! اور پھر عورتیں اس کے جسم کی طرف گھورتیں لیکن نوری ایک کنواری لڑکی سے زیادہ کنواری تھی۔ بچہ تو کیا اس کے پیدا ہونے کا گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ نوری منہارن، اس کو کیا ہو گیا تھا اکثر آٹھ دس سالہ لڑکیاں اس کے جسم کا پاس سے بغور معائنہ کرتی تھیں اور پھر اپنی ماؤں سے چپ چاپ جا کر کہہ دیتیں' ماں نوری کا پیٹ تو بالکل سپاٹ ہے۔ قطعی سپاٹ "

" عجب! پھر نوری کون سے بچے کے لئے تیاری کر رہی ہے۔ کون سے بچے کے انتظار میں اتنی بے قرار ہے "۔

" نوری! بی نوری!! آخر تم کیا کر رہی ہو۔ یہ ننھے ننھے کپڑے۔ ننھے ننھے اُننے یہ سب چیزیں آخر کیوں "؟

نوری شرم سے اپنی گردن جھکا لیتی۔ اس کا چہرہ اتنا ہی سُرخ ہو جاتا جتنا کہ ایک نئی شادی شدہ حاملہ لڑکی کا کسی ادھیڑ عمر عورت کا اس کی ساس اور نند سے آنے والے بچے کے بارے میں تذکرہ کرنے سے ہو جاتا ہے۔ نوری اماں!! قہقہہ۔ تعجب، آسمان نیلے ایک نئی بات کیا بغیر شادی یا بغیر ناجائز تعلق کے کوئی بچہ پیدا ہو سکتا ہے۔ شاید نہیں۔ . . . مگر نوری جس نے اپنی جنسی تنہائی میں نیلے آسمان کو دیکھا تھا اور نیم کی ہلتی ہوئی ٹہنیوں بور اور بنولیوں کا پھلنے پھولنے مشاہدہ کیا تھا اُڑتی ہوئی ابابیلوں اور رجھاتی ہوئی گالیوں سے عجب عجب سبق سیکھ لئے تھے۔ اسے اُمید تھی کہ ضرور بچہ پیدا ہوگا پھر وہ کتنی خوش ہوگی۔ کتنی . . . . . وہ ننھے ننھے کپڑوں کو الٹتی پلٹتی ننھی ننھی

چوڑیاں تیار کرتی۔ اور اکثر اسے کچھ دھندلا دھندلا سا دکھائی دیتا کہ ایک بچہ ماں کی چھاتیوں سے لٹک لٹک کر چپر چپر کر رہا ہے اور وہ تیج تیج کرنے لگتی۔ اور ایک روز اس نے ایک جھولا سا بنا کر چھپر کے ایک بانس سے لٹکا دیا۔ اور دن بھر لوریاں اور گیت سے گانا شروع کر دئیے۔

"سو جا میرے لال! سو جا! میرے چاند! میرے بچے!" اور پھر۔۔۔

بور لگ گیا تھا مگر پھل نہیں آیا۔ بہت دن بیت گئے نوری کا اشتیاق گھٹتا گیا وہ سست پڑ گئی تھی۔ بھٹی کے سہارے بیٹھنے میں اُسے اذیت محسوس ہوتی تھی۔ کہاں تک کب تک! آخر خدا اس سے ناراض کیوں ہو گیا ہے۔ اسے ہر بات پر ایک جھونجل سی آتی تھی اور وہ ہر ایک چیز کو ادھیڑ دینا چاہتی تھی اور پاگلوں کی طرح نو عمر ماؤں کی مانند ان کے بچوں کی طرف دیکھتی رہتی اس کا جسم گرنا شروع ہو گیا۔ وہ سرخی، وہ گدرایا پن۔ وہ گداز وہ حُسن سب ماند پڑ گیا۔

"نوری تم اب کیسی چوڑیاں بناتی ہو۔" گاہکن اس سے اکثر کہتیں۔

"ایسا ہی ہے بی بی"۔ وہ اپنی چھاتیوں کو پلے سے ڈھکے رہتی۔ تمام کپڑے جو اس نے اپنے خیالی بچے کے لئے تیار کئے تھے سب کا ڈھکے صندوق میں مقفل کر دئے تھے۔ شاید بور بجلی کے گرنے یا بارش کی وجہ سے مٹی ہو گیا تھا۔ اور جب بور گل جاتا ہے تو پھل نہیں آتا۔ بہت سے درختوں میں ساری عمر پھول لگتا ہے نہ پھل آتا ہے۔ کیا اچھا اگر بور کے بجائے پھل لگتا مگر! نوری کی خاموش نگاہیں اس کی آسمان کی طرف آنکھیں اٹھا کر التجائیں، سب آس، اداسی کا غیر مرئی سایہ تھا جو اس کے دماغ پر چھا گئی تھی جس کی وجہ سے اسکی آنکھوں

کی روشنی تمام خوبصورت چیزوں کے لئے معدوم ہوتی نظر آتی تھی۔

نوری دن بدن کمزور ہوتی گئی - ایک دم نڈھال - آس پاس، اڑوس پڑوس کی عورتوں نے تیمارداری تک بھی نہ کی، کیوں کرتیں۔

اور جب ایک روز جنگجو مُرغ نے نہایت آرام کے ساتھ ککڑ کوں ککڑ کوں کر کے صبح کا پیغام اپنی مالکہ کو سُنایا۔ مُرغی کے نوزائیدہ بچوں نے چیں چیں شروع کر دی، تب بھی نوری نہ جاگی۔ اس نے اپنی چھاتی سے ایک تکیہ لگا رکھا تھا۔ ایک بچہ سا جو اس کی چھاتیوں سے چوس چوس کر دودھ پی رہا تھا۔

نوری منیہارن کی چوڑیاں جو اکثر نوشادی شدہ دلہنوں، اور لڑکیوں کے ہاتھوں میں کھنکھناتی تھیں سب نوری کے ساتھ ختم ہو گئیں۔

بور لگ گیا تھا مگر پھل نہیں آیا۔ اور نوری کا درخت آیندہ پھل کی امید میں ہمیشہ کے لئے سوکھ گیا۔

"ہندوستان ویکلی" (ادبی نمبر) اگست سنہ ۱۹۴۳ء

ڈھلوان

بنگلے کے سامنے دیکھتے دیکھتے ایک ڈھلوان سی پیدا ہو گئی۔ پہلے زمین ہموار تھی۔ جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں اُگ آئی تھیں۔ سفید، کالی، مٹیالی سی بکریاں ان کانٹے دار جھاڑیوں کے پتّے مزے لے لے کر چبا چبا کر کھاتی رہتی تھیں۔ کھلے موسم میں آفتاب کی اُجلی کرنوں میں شاذ و نادر ہی ان جھاڑیوں میں ہرے ہرے کچھ پھیلے سے پھُولوں پر اپنے پروں کو جھلملاتی تیتریاں منڈلاتی پھرتی تھیں۔ بنگلے کے سامنے کچھ اُلٹے سیدھے گملے سجا رکھے تھے۔ پھر بھی جب کبھی سر بلند اپنے بنگلے کے دروازے پر کھڑا ہو کر اس ویرانے میں نگاہ ڈالتا۔

جو اس کے آس پاس چھا سا گیا تھا۔ تو ان پھولوں کی رونق ماند پڑ جاتی پھیکا سا آسمان، اداس ماحول ننگی قدرت اور کچھ نہیں! کچھ نہیں!! اس کی نگاہ گھوم کر پھر اپنے مرکز پر واپس آجاتی۔ شاید ہموار زمین پر کوئی نئی بات پیدا ہوتی ہی نہیں۔ ہموار زمین پر کوئی واقعہ نمودار ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ ان کے واقع ہونے کا امکان ہی نہیں لیکن، سرندر سوچتا تھا آخر یہ دُنیا اتنی ہموار کیوں ہے۔ جب تک زندگی کے سفر میں انسان گھاٹیوں پہاڑ کی چوٹیوں دریا کے کنارے نہ دیکھے۔ اس وقت تک زندگی کے نام سے پورا پورا انصاف نہیں ہو سکتا۔ کیا ہوا اگر چٹیل میدان ہو دُور تک سوکھے پیڑ جگہ جگہ کھڑے ہوں اور محض ایک ویرانگی کا عالم زیادہ سے زیادہ بکریاں اس کو دیکھ کر اپنی تھوتھڑیوں کو اوپر کی طرف اُٹھا کر کہنے لگتی ہیں! میں!! خوبصورت خوبصورت بکریاں۔ حیوان بھی کتنا خوبرو ہوتا ہے۔ اس نے خوطوطوں کے بچوں کو اپنے بنگلے میں پالا تھا۔ ان کا رُواں کتنا ملائم تھا۔ بالکل مَلمَل ایسا۔ اور لمس وہ طوطے کے بچے کے رونئیں پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے ایک عجیب جذباتی دُنیا میں کھو جاتا۔ حیوان خوبصورت ہے۔ اسے کسی بناؤ سنگھار کی ضرورت نہیں اور انسان۔ انسان، اُس کی رُوح پھڑک اُٹھی انسان بھی نہایت خوبصورت شے ہے۔ مگر اس ویرانے میں؟ کیا؟ کچھ نہیں۔ دھندلے دُھندلے خیالات نے اس کے دماغ پر تسلّط جما لیا تھا۔

خدا کی شان سرندر کو رہنے کی کوئی جگہ نصیب ہوئی۔

وہ نہایت پریشان تھا۔ اُسے ہموار زمین سے نفرت تھی۔ اس کے خیالات ایک دم ہموار ہو گئے تھے۔ وہ ڈھلوان گھاٹیوں پہاڑوں، پیچ در پیچ

پگڈنڈیوں کے خواب دیکھتا تھا۔ اُسے پگڈنڈی پسند تھی۔ پگڈنڈی میں بغاوت
ہے وہ لمبی سیدھی نہیں چلتی۔ اکثر کسی دوشیزہ کے کاکلِ پیچاں کے مانند سانپ
کے پھن کی طرح لہراتی سی چلتی تھی اس واسطے اسے پگڈنڈی بہت پسند تھی۔
اور ویرانے میں پگڈنڈی نہیں بنتی۔ ویرانے کا چپہ چپہ انسانی قدموں کے نیچے
سے گذرتا ہے۔ ویرانے میں ایک پگڈنڈی نہیں ہوتی بلکہ بہت ساری پگڈنڈیاں
ہوتی ہیں۔ اور تمام ملکر پھر مجموعی طور پر ویرانہ بن جاتی ہیں۔ پگڈنڈی۔ وہ ہرے
بھرے کھیتوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ ان میں کتنی اچھی اچھی پگڈنڈیاں ہوتی
ہیں۔ کنوؤں پر چرس چلتے ہیں۔ لڑکیاں اپنے سروں پر کھانا رکھ کر ناچتی ہوتی
ان چرسوں کی طرف مائل ہوجاتی ہیں۔ جب کسان ایک اُمید بھری آواز میں ہانک
لگاتا ہے۔ "درام سنائیو"۔ . . . . اور پگڈنڈیاں وہ بھی اس انداز سے زمین پر
پیدا ہوتی ہیں کہ ان کی خوبصورتی کو دیکھ کر انسان کو رشک آتا ہے۔ اکثر اُس نے
پگڈنڈی کو اُس جگہ ختم ہوتے ہوئے دیکھا تھا جہاں زمین اور آسمان ملتے ہیں۔
یا شاید جہاں ایک بہت عمیق ڈھلوان ہے۔ ایک دم گہری اور راہی اس ڈھلوان
پر اُترتے اُترتے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ شام کے وقت اکثر اس
ڈھلوان کے کنارے ان دوشیزاؤں کو اپنے ملتے ہوئے اپنل محبت Silhouette
میں دیکھا ہے۔ کتنا عظیم منظر، خوشنما تصویریں اور ان کا دلربا پس منظر ۔۔۔
وہ ڈھلوان' ان راہیوں کو آگے بڑھنے کی دعوت دیتی ہے۔ راہی اس ڈھلوان
سے محبت ہے۔ وہ ہر شام اس ڈھلوان پر اُتر کر شاید کسی ایسے ملک میں پہنچ جاتا
ہے۔ جہاں غم ہے نہ خوشی ہے۔ اور شاید اُس نے سوچا شاید جب انسان اپنے

کسی ساتھی سمیت دُنیا والوں پر گراں ثابت ہو جاتا ہے۔ تو وہ انسان اس ساتھی کو لے اُس ڈھلوان پر اُتر جاتا ہے۔ جو کہ سمندر سے زیادہ گہری ہے۔ خدا نے دُنیا کی تمام مصیبتوں کا بھلانا تجویز کر دیا ہے۔ اور وہ ہے ڈھلوان۔۔۔۔ کتنی اُونچی اور کتنی گہری جو چیز اُنچی ہوتی ہے وہ اکثر گہری بھی ہوا کرتی ہے۔ اور شاید اسی ڈھلوان پر اُترنے اُترتے بہت سی ہستیاں موت کی کھائی میں اُتر جاتی ہیں۔ جانے دو شاید ڈھلوان کا خیال ہی غلط ہے۔ سراسر گمراہ کن۔۔۔۔ ہمواری بہتر ہے۔ ہموار زندگی۔۔۔۔ لیکن وہ ہر وقت اس زندگی کے بارے میں سوچتے سوچتے تنگ آجاتا۔

ایک بنگلہ تھا۔ اُس کی ماں تھی۔ سریندر کی ماں۔ زندگی کا ڈھیر ایک کھنڈر۔ دن بھر صحن میں کھٹیا پر لیٹی لیٹی فو فو کرتی رہیں۔ سویرے شام چولہا پھونک لیا اور بس۔ بنگلے کے عقب میں ہلکا سا گاؤں تھا۔ وہاں سے دودھ آٹا کھانے کا سامان بھی وہیں سے خریدا جاتا۔ ایک نوکر رکھ رکھا تھا۔ وہ صبح حاضری دینے کے بعد شام کو آتا اور کچھ نہیں بکریاں، اجاڑ سا ویرانہ آک اور جھربری کے درخت۔ کسی زمانے میں اُس جھونپڑے نے سونے کے دن اور چاندی کی دولتیں دیکھی تھیں۔ لیکن اب محض ویرانی۔ اُن دنوں نیل کی کاشت ہوتی تھی۔ نیلا رنگ بنتا تھا۔ لیکن جب سے ۔۔۔۔۔ رنگ وجود کی دنیا میں آئے نیل کی کاشت عنقا ہو گئی۔ اور سریندر اگر اپنی ماں کو شہر کی گندی فضا سے بچانے کے لئے اس بنگلے میں لے آتا۔ اُس کی ماں کی بیماری بھی خدا کا عجیب سا عطیہ تھا۔ وہ کہتی سریندر سریندر میرا دل گھٹ گیا۔ بیٹا کوئی میرا

گلا گھونٹ رہا ہے۔ میرا دل مرا گلا۔ ۔ ۔ ہائے! ہائے!!

"اچھا ماں چل۔ اس شہر سے دور چل۔"

اور وہ اپنی ماں کو وہاں اُجاڑ اور فضول سے بنگلے میں لے آتا۔ بنگلہ، قدرت کی گود میں ایک گھبرایا سا بچہ، جو ہر کس و ناکس کو متعجب نگاہوں سے دیکھے وہ بنگلہ سر بندر کے دل کی طرح اُداس تھا۔ چھپتے سورج میں اُس کا رنگ فاختئی بن جاتا، فاختئی رنگ، ناامیدی کی علامت ہے۔ وہ نیلے نکھرے آسمان کی طرح اُمیدوں کی دُنیا پر نہیں چھا جاتا۔ اس میں جھیل پانیوں ایسی قناعت کہاں۔ صبح جب سنبل و نسترن کے رنگین خوابوں کو اپنے دامن میں چھپائے اس بنگلے کے چاروں طرف چکر کاٹتی تو سر بندر کے دل کا کنول کھِل جاتا۔ وہ اپنے بنگلے کے سامنے کرسی بچھا کر بیٹھ جاتا۔ اس وقت وہ سوچنے لگتا اس کے بنگلے کے سامنے ایک ڈھلوان پیدا ہو جائے ایک ننھا سا تالاب اور صاف پانی اس میں نیلوفر کے پھول پرورش پائیں۔ اور ہر صبح اس تالاب کے پانیوں میں سائے ناچیں۔ رنگ برنگے سائے۔ کڑیوں کی جھنکار اور۔ ۔ ۔ ایک زندگی جس میں ہمواری بہت نہ ہو۔ بلکہ اکثر گھاٹیاں تالاب پہاڑ اور ان پہاڑوں پر گوگل کے درخت خاموش سنتری کے مانند کھڑے ہوں۔ اور وہ عمیق ڈھلوان شام کے وقت دو بیل کی مورتیوں کو اپنے جگر میں تڑپ کرتی کرتی اندھیرے میں غائب ہو جائے۔ لیکن ہر جگہ اُس کی ماں کی خو خو کی آواز اس کے سکوت کو توڑ دیتی۔

"کیا ہے ماں؟"

"کچھ نہیں بھیا - باہر ہوا کیسی ہے؟"

"بہت اچھی ہے - چلئے"

وہ اپنی ماں کو باہر بنگلے کے آگے ایک کرسی بچھا کر بٹھا دیتا - اُس کی ماں کہتی "کیا اچھا سماں ہے - طبیعت ایک دم کھل جاتی ہے - تیرے والد بھی اس جگہ سے بہت محبت کرتے تھے" سریندر اپنی ماں کی بات سنتا اور ہاں ہاں کرتا رہتا۔ صبح کے نیلوفر کے تالاب خشک ہو جاتے۔ پہاڑوں کا سلسلہ شام کے سایوں میں غائب ہو جاتا اور ڈھلوان - وہ بیٹے کا نام تک نہیں لیتی - محض ہمواری؟ اس کی ماں کے ہموار خیالات کے مانند چٹیل سا میدان اُجڑی سی فضا بوڑھی قدرت جو زمانہ کی سرد گرم ہوا کھا کر زندگی کے تمام رنگین قوانین سے منہ موڑ چکی ہو - اُس کی ماں، اُف دُنیا کتنی خود غرض ہے - اس کی ماں اپنی غرض میں اتنی کھو گئی ہے اسے یہ تک معلوم نہیں کہ دُنیا میں شباب کبھی کبھی آتا ہے اور جب شباب ایک پتھریلی چٹان پر غرور و خوض کی دُنیا میں کھو جاتا ہے تو اس کا غم ہموار اور چٹیل میدان - ماں کی خود غرضی دور نہیں کر سکتی - مجسم غم - زیست کو برقرار رکھنے کے لئے بیتاب اپنے آپ کو اکثر ایک چھوٹی سی جگہ میں سمیٹ لیتا ہے - اس کے جذبات سکڑ جاتے ہیں لیکن وہ اس چھوٹی سی جگہ میں سکڑ سکڑا کر بھی رہنا چاہتا ہے - سریندر اس پر فضا مقام میں اپنے آپ کو نہایت گھٹا گھٹا محسوس کرتا تھا -

"ماں، دل نہیں لگتا - یہاں کچھ رونق ہی نہیں - یہ چٹیل سا میدان، یہ جھاڑیاں اور ۰ ۰ ۰ ۰" سریندر اپنی ماں سے کہتا - اس وقت اس کی نگاہ

اُفق کی لکیروں کی طرف گھوم جاتی - شاید وہاں ہمواری ختم ہو جاتی ہے - وہاں اسکی ماں نہیں ہے جو اس سے کہے "بیٹا ذرا ہوا میں کھُل کر بیٹھو - صحت اچھی ہو جائیگی - تگڑے ہو کر کچھ زندگی میں کام کر سکو گے اور جب تم کو گھر سنبھالنا پڑے گا تو پھر طبیعت لگنے اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نا لگنے کا سوال کیا؟"

" اُف میں کہتا ہوں - کچھ نہیں بس ذرا کچھ نہیں !! بس ذرا ہمواری دیکھکر طبیعت گھبراتی ہے اور ـــ"

" بیٹا! اب شہر میں چل کر پھر مجھے گھوٹ دیگا - اب ذرا طبیعت سنبھلی ہے اور تجھے شہر چلنے کی لگی - آج کل کے نوجوان بھی انوکھے ہیں - پہلے زمانہ میں اُنہیں اپنے کام سے کام - پڑھ لئے لکھ لئے اپنا کام سنبھالا - کھایا پیا آرام کیا - بس اور کیا ؟"

" کچھ نہیں - یونہی کبھی کبھی دل میں نامعلوم کیا کیا اُلٹے سیدھے جنونی خیالات اُبھرنے لگتے ہیں - اور پھر نامعلوم بغیر کہے کچھ بن نہیں پاتا - سب سے زیادہ مجھے آپکی صحت کا خیال ہے - ۔ ۔ "

اور اُس کی ماں اُس ڈھلوان میں نہیں جھانک سکتی تھی جو روز بروز چٹیل میدان کو دیکھ کر سرِیندر کے دل کے اندر ہی اندر گہری ہوتی جا رہی تھی - وہ ڈھلوان جس میں شباب سر کے بل لڑھکا جانے کا خواہش مند ہے - ڈھلوان کی خواہش اک نئی زندگی کی تمنا ہے - اور ڈھلوان ان تمناؤں کا عکس ہے - اور جب شباب زندگی کے موڑ پر قدم رکھتا ہے تو یہ ڈھلوانیں اکثر پیدا ہو جاتی ہیں - شباب تو کیا شباب کا خیال تک ناہموار ہے اور سرِیندر ۔ ۔ ۔ ۔ ہمواری

اس کے دل کو کھائے جا رہی تھی۔ نیلا ننگا آسمان اُسے کاٹنے کو دوڑتا تھا نہ ستاروں سے پیار نہ خنک ہوا سے لگاؤ۔ یہ احساسات اُسے نراش اور نا اُمیدی کی تنگنائے میں نہ پاتے تھے۔ کیا اُس کے جذبات مُردہ ہو جائیں گے؟ کیا وہ اپنے خیالات میں اتنا کھو دیگا کہ وہ ایک دم فنا کی گود میں سو جائیں گے۔ کیا؟ اور وہ خیال کی اُس منزل میں پہونچ جاتا جہاں نا اُمیدی اور آس کا سنگم ہوتا ہے۔ جہاں زندگی کی آگ جلتی ہے۔ اور بُجھ جانا چاہتی ہے۔ وہ ایک روشن تاریکی ہے اور غم دیا اس کی تیرگی میں چاندنی ایسی سفید لکیریں ہیں۔ اس وقت وہ ایک فلاسفر بن جاتا۔ دُنیا متحرک ہوتی اور وہ ساکن۔ ایک دل جو حرکت کے لئے بیقرار، جیسے سر کے بل ڈھلوان پر دوڑنے کی خواہش تھی۔ درختوں کی ڈالیوں پر لٹک لٹک کر کُود جانے کی آرزو...... پھر......

پھر آسمان میں بادل چھائے۔ کتنی ہی پہاڑ اور گھاٹیاں بن گئیں۔ اور ڈھلوانیں نمودار ہو چلیں۔ سریندر کو بادل پسند تھے جو اُس کے دل پر اپنا پرتو ڈال رہے تھے۔ بادل چھاتے اور بارش ہوتی۔ وہ چٹیل میدان تبدیل ہو جاتا۔ اس نے کتنی ہی ہری ہری آنکھیں اپنے دامن میں سمیٹ لیں۔ سریندر نے محسوس کیا کہ وہ خوش ہے اُسے بادل پسند ہیں۔ ان بادلوں کے پیچھے اُس کی تمنا کا غیر مرئی سایہ ہے...... شباب کا غیر مرئی سایہ۔ اُس کے جذبات ناچ اُٹھے۔

"ماں! دیکھو کتنا اچھا سماں ہو گیا...... اب میری طبیعت یہاں خوب بہلتی ہے۔"

"ہاں! اکثر ان بادلوں کو دیکھ کر دل گھٹ سا جاتا ہے۔ جب یہاں نیل کی کھیتی ہوتی تھی۔ اور اس کے پودوں کو کاٹ کر حوضوں میں سوکھنے کے لئے ڈال دیا جاتا تھا تو ہر ایک آدمی یہی دُعا مناتا تھا۔ کہ بارش نہ ہو۔ ورنہ تمام سارے سال کی محنت گئی۔ ذرا بادل آئے اور دل سوکھا" اور اس کی ماں خیالات کے زیر اثر جو اسے پُرانے زمانہ کی نااُمیدیوں میں گھما سا دیتے فوٹو کرنے لگتی۔

اُونہہ، سریندر اپنے دل میں کُڑھتا۔ بزرگوں کو سوائے اپنے نفع نقصان کے بارے میں سوچنے کے اور کچھ کام ہی نہیں۔ وہی پُرانے قصے وہی پُرانی باتیں صدیوں کے پیمانوں کو اُلٹنے سے کیا۔ ان کا پیمانہ پھر خود بخود ان چیزوں سے بھر جائے گا۔ کیا پُرانی آوازیں قائم نہیں رہتیں۔ پھر ان کے دُہرانے کا کیا کام اس کا دل حال میں کچھ ڈھونڈتا تھا۔ حال کا پیمانہ خالی ہے اور اُسے بھرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اور جب بادل آسمان کے سہارے سہارے دوڑ کر اس دُنیا کا مطالعہ کرتے جس کو دیکھنے کی اُنہیں بہت تمنّا ہوتی ہے۔ اور تمنّا کے بعد ناراضگی کا اظہار ہوتا تو وہ برس پڑتے۔ سُورج دیوتا نقاب اوڑھ لیتے اور اس ویرانے میں ہریالی ہر روز بڑھتی گئی۔

ایک روز . . . . .

نوکر گھبرایا ہوا سا داخل ہوا۔

"ماں جی" اس نے سراسیمہ ہو کر کہا زمین دھسک گئی ماں جی!"

"ایں! کیا ہوا"۔ سریندر کی ماں نے مضطرب ہو کر کہا۔ سریندر بنگلے سے باہر گیا ہوا تھا واپس آیا۔

اُمید تھی کہ برسات جاری رہے گی لیکن بادل کا دل سوکھ گیا۔ شاید اس کے غم کے سوتے بند ہوگئے تھے۔ بارش بند ہوگئی۔

دوسرے روز سورج اپنی تمام تر خوبصورتیوں کو لے کر نمودار ہوا۔ اور دن بھر چمکا۔ اس کی روشنی میں پہلے سے زیادہ تیزی تھی۔ کیونکہ بارش نے ہوا میں ریت کے معلق ذرّوں کو دھو دھو کر نکھار دیا تھا۔ نئے تالاب کا پانی چمک اٹھا۔ سریندر اس روز اسے دن بھر دیکھتا رہا۔ اور پھر ڈھلوان بھی سورج کی کرنوں کے زیر اثر کتنی بھلی معلوم دیتی تھی۔ صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہونے کو آئی۔ پیازی رنگ کے حلقے نے آسمان کے گرد چھاؤنی سی ڈالدی۔ ڈھلوان کا رنگ فاختئی سا ہوگیا۔ اور وہ دیکھتے دیکھتے ایک ایسی خلا سفرہ بن گئی جو دنیا کا مطالعہ کرنے میں مصروف ہو۔ ہوا آنچل، خنک ہوا، ڈھلوان پر ایک صورت نمودار ہوئی ایک پیتل کی سی مورتی جو اپنی روشنی کو ڈھلوان پر بکھیر رہی تھی۔ پھر۔۔۔۔

پیر پھیلا کر وہ صورت ڈھلوان کے سہارے سہارے قلابازیاں کھانے لگی۔ سریندر دوڑا آخر ڈھلوان کتنی خطرناک ہوتی ہے۔ ذرا نگاہ پھسلی اور نیچے۔

"کیا ہوا؟" سریندر نے تشویشناک لہجہ میں دریافت کیا۔ سنہری بالوں میں مٹی اور ریت کے ذرات لگ گئے تھے۔ لڑکی حیران سی کھڑی ہوئی معلوم پڑتی تھی۔ دیہات کا حسن غیر مترقبہ واقعات کو دیکھ کر شرمائے جا رہا تھا۔ پاس ہی جنگلی پھولوں کا پودا ہوا میں لہرا رہا تھا۔ ہوا میں ایک عجیب سی خوشبو سرایت کرتی جا رہی تھی۔

"ہاں! بہت غضب کی بارش ہے یہ —— باہر میدان میں ایک دم کتنی زبردست ڈھلوان پیدا ہو گئی۔ رات ہی رات میں شگاف پیدا ہو گیا۔ بہت بڑا شگاف....."

زمین میں ایک عجیب گڈھا سا پیدا ہو گیا تھا۔ زمین خود بخود اکھڑ کر ایک گڈھے میں گرتی جا رہی تھی۔ اور گڈھے کی وسعت ہر لمحہ ترقی پا رہی تھی۔ شاید پانی ڈھلوان کی طرف بہتا ہو۔ اور اس گڈھے کے آس پاس کے علاقہ کا تمام پانی چٹیل میدان کی طرف دوڑ رہا تھا۔ ڈھلوان بڑھتی جا رہی تھی۔ اور ایک تالاب سا وجود میں آ رہا تھا۔ بنگلے کے عقب میں چار پانچ فرلانگ پیچھے بسنے والے گاؤں کے لوگ وہاں جوق در جوق آنے لگے۔ چٹیل میدان کی شکل بدل چکی تھی۔ 'ڈھلوان' تالاب' پانی' عمیق گہری وادیاں اور شام کے وقت اس ڈھلوان پر اترنے والے ہلتے ہوئے آنچل، تمتماتے ہوئے رخسار، شریر خوبصورت بچے' زندگی اور موت کا عنوان ساتھ ساتھ لئے پھرنے والی بوڑھی عورتیں۔ کتنی رونق ہو چلی۔ ہمواری ویرانگی کی نشانی ہے۔ اور ناہمواری رونق و مسرت کا پیش خیمہ۔ سریندر گھنٹوں کھڑا اس ڈھلوان کا مطالعہ کرتا رہا اسے ڈھلوان سے محبت ہو گئی تھی۔ اس نے ڈھلوان کے زیریں حصہ میں بھرے ہوئے تالاب کے اندر سانپ ناچتے ہوئے دیکھے تھے۔ ننھا نیلوفر کھولوں کو پرورش پاتا ہوا دیکھا تھا۔ ڈھلوان اس کی زندگی تھی خواہ وہ اس کی عمیق گہرائی میں غائب ہو کر ہستی و بود کی کلفتوں سے آزاد کیوں نہ ہو جائے۔ جوں جوں اس تالاب نے نئے انداز میں ڈھلنا سیکھا جوں سریندر کے خیالات نے نئی نئی شاہراہیں اختیار کرنی شروع کر دیں اسے

"کچھ نہیں۔ مجھے کچھ چوٹ نہیں آئی۔ یہ ڈھلوان بہت بُری ہے"۔ لڑکی سنبھلی اُس نے اپنے کپڑوں کو جھاڑا۔ بالوں پر اُنگلیوں کو پھرا کچھ طائی سی شرائی سی وہ واپس جانے لگی۔ لیکن وہ بار بار مُڑ کر اُس تالاب کی طرف دیکھتی جارہی تھی جو اُس ڈھلوان کے زیریں حصہ میں جلد یا بدیر نیند کی آغوش میں سو جانا چاہتا تھا۔

"چلیے میں تالاب دیکھنے آئی تھیں کیا شوق سے دیکھیے"۔

شہابی ہونٹوں پر دو گلاب کے پھول کھلے۔ اور پھر آپس میں گلے مل گئے۔ رات کی دیوی اُفق کے کنارے کھڑی اپنے دروازوں کو کھول کر تاریکی کو دنیا میں قیام کرنے کی دعوت دینے کے لئے تیار تھی۔

"وہاں تالاب دیکھا ہے"۔ لڑکی نے آہستہ سے دُہرایا۔

"چلیے ڈرنے کی کوئی بات نہیں ڈھلوان کے نیچے تالاب تو پیدا ہو ہی جاتا ہے اور یہ تالاب بھی بہت عجیب ہے۔ میں اس میں کنول کے بیج ڈالوں گا تو پھر بہت ہی رونق ہو جائے گی"۔

"ہاں کیوں نہیں!" لڑکی اور سریندر آہستہ آہستہ ڈھلوان سے نیچے اُتر رہے تھے۔ وہ ڈھلوان جو سریندر کے شعور میں اُفق کے کنارے کنارے جانے والی ڈھلوان کے خیالات سے پیدا ہو گئی تھی۔ اور اب وہ اُس کی آنکھوں کے سامنے موجود تھی۔ اور وہ سائے جو اُس نے اکثر عمیق ڈھلوان کے نیچے غائب ہوتے ہوئے دیکھے تھے اب اس تالاب کی طرف قدم بڑھا رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ڈھلوان نہایت گہری نہایت لمبی بن جائے۔ اور وہ سائے ابد تک اسی ڈھلوان پر پھیلی ہوئی مٹی اور اُگے درختوں کے ساتھ لہو و لعب میں مشغول رہیں۔

دو اندھیرے سائے تالاب کے کنارے تک دوڑ سے رہے تھے قطعی تاریکی۔ اور وہ سائے تاریکی میں غائب ہو گئے۔ سریندر کی ماں بنگلے کے اندر بیٹھی بیٹھی کھانس رہی تھی۔ نئے نکلے چاند کی روشنی میں تالاب کا پانی جگمگ اٹھا ڈھلوان، دو بیل کی مورتیں اور تالاب۔

"یہ ہے تالاب۔ پسند ہے تم کو"۔

"ہاں بہت اچھا تالاب ہے۔ اس میں کنول کے پھول بہت اچھے کھلیں گے۔ ہیں نا!"

"ہاں پھر تم دیکھنے آنا تو ڈھلوان سے پھسل نہ پڑنا نہیں تو دوسرے روز صبح ہی گدھوں چیلوں کا ہجوم اس جگہ منڈلانے لگے گا۔ جانے دو . . ." سریندر نے ہاتھ کی ہتھیلی میں پانی لیا۔ اور پھر اسے چھوڑ دیا۔ ترل رل ترل کی سی آواز پیدا ہو گئی۔ "دیکھئے پانی بھی گاتا ہے"۔

"ہاں! اس تالاب میں پہلے کنول کے پھول اگائیے پھر میں روز دیکھنے آیا کروں گی۔ تمتماتے ہوئے رخساروں میں سرخی دوڑی جا رہی تھی۔ شفق کا سرخ سایہ رات کی پھیکی چاندنی میں بکھر رہا تھا۔ سریندر کے خیالات ایک ڈھلوان کے اتار کے ساتھ ساتھ بھاگے جا رہے تھے۔ نہایت تیزی کے ساتھ۔

تالاب میں دو سائے کانپے۔ وہ دونوں سائے ایک دوسرے کے کتنے قریب پہونچ گئے تھے۔ شاید وہ سائے ان دو روحوں کے سائے تھے جو مدتوں ایک دوسرے سے ملاپ کرنے کے لئے بھٹکتی پھرتی ہیں۔ کبھی کبھی ہو جاتی ہے قدرت ایک ایسا ماحول پیدا کر دیتی ہے۔ جس میں واقعات کا گھر اتفاق ہوتا ہے۔

ایک غیر مرئی کشش ایسی دو روحوں کو پہاڑیوں کی مختلف ڈھلوانوں سے اکثر تالاب کے کنارے کھینچ لاتی ہے۔ پھر تالاب میں دو سائے پڑتے ہیں۔ ڈھلوان اُن کو دُنیا کی نگاہوں سے بچاتی ہو۔ کھلنے والی کلی مستی اور جنون کے انداز میں نئی زندگی کے پہلے تڑکے ان خوابوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی ہے جو اُس نے اپنی خیالی دُنیا میں اکثر بیشتر دیکھے ہیں۔ سریندر نے محسوس کیا شاید وہ ہمواری جو اُس پر غالب آگئی تھی ایک دم ختم ہو گئی ہے۔ اب اُس کی زندگی میں گھاٹیاں ہیں۔ تالاب میں ایک ڈھلوان ہے اور کنول کے پھول کی تمنا جلد یا دیر میں پھوٹ پڑنا چاہتی ہے۔ اُس نے تالاب کے پانیوں میں جھانکا اور اُس رات کی پُر اسرار چاندنی میں اُس نے دو سایوں کو گلے ملتے دیکھا۔ شاید وہ سائے باتیں کرتے معلوم پڑتے تھے۔ گفتگو۔

"تم نے تالاب دیکھا؟"

"ہاں"

"بھلا اس میں کنول کے پھول کتنے اچھے کھلیں گے"۔

"بہت اچھے! بہت اچھے!!"

"بہت اچھے"۔ اسر یندر نے لڑکی کی طرف دیکھا "بہت اچھے!"

اک دیوار شاید بن کر گر پڑنا چاہتی تھی۔ "تم کتنی اچھی لڑکی ہو"۔

"میں"   "ہاں"

"تو پھر مطلب"؟

"مطلب کچھ نہیں میں سوچتا ہوں بالفرض اس تالاب میں کنول کے پھول

کھل گئے تو میں اُن کو کس کو پیش کروں گا۔ سوچ رہا ہوں کچھ بن نہیں پڑتا۔"
سریندر کے چہرے پر فلسفیانہ رنگ اُتر رہا تھا۔ اور اُتر کر پھر اُسے عوام الناس کے گروہ میں شامل کر رہا تھا۔ اُس نے اپنی آنکھوں سے لڑکی کے سڈول بازو، گول آنکھیں، گدرائے ہوئے جسم کی طرف دیکھا۔ اس کا ہرا آنچل خنک ہوائیں سریندر کے خوابیدہ جذبات کو تھپ تھپا رہا تھا۔ جو ہمواری میں موت کی نیند سو گئے۔ اور ڈھلوان پر مجسم حرکت بن جانا چاہتے تھے۔ ایک پتیل کی مورتی تھرا سی گئی تھی۔
لڑکی خاموش تھی۔
سریندر خاموش تھا۔ سریندر آگے بڑھا۔ اور اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو لڑکی کے کندھے پر نزاکت سے رکھ دیا۔
"اس ڈھلوان پر احتیاط سے اُترنا سمجھیں شاید گر نہ پڑو۔ اور مجھے بچانے کے لئے دوڑنا نہ پڑے اور تم۔"
"میں" لڑکی بولی شاید اُس کا گلا گھٹ سا گیا تھا۔
"تم اس گاؤں کی خوبصورت ترین لڑکی ہو۔"
"میں!"
"ہاں! اس ڈھلوان پر آؤ گی نا۔ اگر نہیں آئیں تو کنول کے پھول کیسے کھلیں گے۔"
"تم آخر چاہتے کیا ہو؟"

چاندنی رات میں اکثر اس تالاب کے سہارے مسکرایا کرے بس۔"

لڑکی چپ چاپ ڈھلوان کی بلندی کی طرف چل دی۔ ذرا اوپر جا کر اس نے بے تحاشہ بھاگنا شروع کیا۔ بے تحاشہ۔ . . .

"ٹھہرو" سرہندر نے تیز تر بھاگنا شروع کیا۔ "ٹھہرو ڈر گئیں"۔

لڑکی ہانپ رہی تھی۔ وہ بھاگتے بھاگتے گرتی پڑتی تھی۔

"مجھے جانے دو"۔

"منع کون کرتا ہے کنول کے پھول دیکھنے آؤ گی نا؟"

"ہاں!"

کنول کے پھول. . . . لڑکی کنول کے پھول کی شائق ہے۔ وہ لڑکی جو ڈھلوان پر اپنے گاؤں کی سمت بھاگی جا رہی تھی۔ جس کے رخساروں میں اس نے کنول کی نازک پتیوں کو بکھرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور ایک زبردست ڈھلوان . . . . نازک گڑھے . . . . شاید یہی زندگی یہی اس کے راگ ہیں ڈھلوان . . . ڈھلوان نہایت خوبصورت ہوتی ہے۔ اس میں کنول کے پھول کھلتے ہیں۔

تمناؤں کے پھول . . . . تالاب، جھرنا، امیدیں . . . . سرہندر کی تمنا پیدا ہو رہی تھی۔ کہ وہ ڈھلوان کو چومنے لگ جائے۔ جس کے ہر مقام پر اس کا دل بلیوں اچھل جاتا ہے۔ شاید انسان ڈھلوان سے اتر کر ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں خوشی کی دنیا کی سلطنت ہے ہاں! وہ اپنی ماں سے جا کر کہے گا کہ وہ انتہائی خوش ہے۔ اسے وہ ڈھلوان پسند ہے۔ اب وہ برسوں اس

بنگلے میں رہے گا برسوں ۔ ۔ ۔ کنول کے پھول اُگائے گا ڈھلوان کے سہارے سہارے ہرے آنچل کو ملنے کی دعوت دیتا اور ناچتے ہوئے سایوں کو دیکھتا برسوں ۔ ۔ ۔

"ہاں" سریندر کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ "ہاں اب یہ جگہ بہت اچھی لگتی ہے۔ ہیں نا!"

"ہاں! مگر بیٹا مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس تالاب میں کیڑے نہ پڑ جائیں۔ دوائی کی گولیاں ڈال دینی چاہئیں۔"

"اں! اب کیسے ہو سکتا ہے۔ میں تو اس میں کنول کے پھول اُگاؤں گا کنول کے پھول، پھر اس بنگلے کی کتنی اچھی رونق بن جائے گی۔ آس پاس کے گاؤں میں اتنی خوبصورت جگہ کہاں ـــ"

کیڑے پڑیں اس کی ماں کے خیالات میں بھلا جس تالاب میں شام کو دو سائے ناچیں وہاں کیڑے پڑنے کا کیا ڈر۔ گویا ہر جگہ آن موجود ہوتے ہیں۔ خیالات میں جذبات میں۔ ہر جگہ ـــ نہیں ہرگز نہیں وہ اپنی کنول کی کھیتیوں اور ان میں تمنا کے پھولوں کے کھلنے کی تمنا کو ہرگز ہرگز فنا نہ ہونے دیگا ۔ وہ ڈھلوان کے کنارے بھاگتے دوڑتے زندگی بتا دے گا ہرے آنچل کے سائے اور سُرخ رُخساروں کی تمتماہٹ کی پناہ میں اُمیدوں اور تمناؤں کے چھینٹوں سے کھیلتا ہوا۔ اُس کی زندگی ایک نہایت صاف شفاف بن جائے گی۔ جو اُن میدانوں سے اُلجھے گی درختوں سے ٹکرائے گی مگر گرے گی جا کر سمندر میں ہی ۔ ۔ ۔ ہاں ۔ ۔ ۔ ہاں !! اُس کے خیالات کبھی اُن باتوں سے متفق نہیں،

ہو سکے"۔ شام ہو چکی ہے پھر صبح آئے گی اور صبح کے بعد شام ..... اور ڈھلوان پر ایک ہلتا ہوا آنچل نمودار ہو گا جو اُس سے دریافت کریگا۔ "ابھی تالاب میں کنول کے بیج ڈالے یا نہیں"۔

بنگلے پر اندھیرا کبھی کا چھا گیا تھا آخر سریندر سو رہا۔

اک نئی صبح آئی۔ سریندر کا دل خیالات سے جگمگا اُٹھا۔ ڈھلوان اور تالاب ایک دم کتنے چمک اُٹھے تھے۔ صاف شفاف وہ تالاب کے کنارے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کا سایہ تالاب میں ناچنے لگا اور شاید وہ اجنبی سایہ بھی اس سایہ سے گلے مل رہا تھا۔ جیرات کو وہاں موجود تھا۔ سریندر نے سوچا شاید ڈھلوان کے زیریں حصہ میں تالاب اکثر سایوں کو جذب کر لیتا ہے اور وہ ابد تک کسی نہ کسی شکل میں قائم رہتے ہیں۔ جو سایہ ایک دفعہ تالاب میں گر گیا وہ دوبارہ اُبھر آتا ہے اس میں وہی اضطراب ہوتا ہے اور وہی حرکت کی بھی ہلتا ہوا آنچل سُرخ رُخسار اور چوٹی ..... جو اکثر کنول کے پھولوں کے درمیان کوئی دوسرا سایہ کھینچے لئے جاتا ہے حتیٰ کہ ....

"بابو جی رام رام!"

"رام رام" سریندر نے بھونچکا بن کر کہا۔

"بابو جی آپ نے یہ کیا کیا اس تالاب کو بھرا رکھا۔ اس کا پانی اُجڑا دیکھئے نہیں تو ....."

"نہیں تو"۔

"اُس میں کیڑے پڑ جائیں گے۔ بیماری پھیل جائے گی۔ سارا گاؤں

ختم ہو جائے گا۔"

"ایں!"

"ہاں! اور وہ لڑکی بسنتی تم کو اس گندے تالاب میں لے ڈوبے گی۔ سمجھے . . . ." نو وارد کا لہجہ ہر لمحہ سختی کی طرف راغب ہوتا جا رہا تھا۔

"بسنتی کون . . . . مجھے معلوم نہیں"۔

"آپ کو کیا معلوم ہوگا صاحب وہی جو شام کو تالاب کے کنارے کھڑی تھی۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"کیا ہوتا؟ آپ بڑے لوگ ہیں۔ کیا جانیں اس لڑکی کا دل دیکھا ہے"۔

"دل!"

"ہاں دل! اتنا بڑا ہے کہ اس نے اپنے باپ کی ڈیڑھ انچ زمین حاصل کرنے کے لئے زمیندار کو اپنی عصمت سونپ دی اور گاؤں سے غائب ہو گئی۔ وہ اکثر ادھر آیا کرتی ہے ادھر . . . ."

سر بلند کی دلچسپی ہر لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔

"کیوں؟"

"اس کا دل نہیں مانتا۔ گاؤں کا ہی ایک نوجوان اس پر مرتا تھا۔ مگر کسی کو اس کے دامن چھونے تک کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ مگر اب جب اس نے اپنے خاندان کی عزت کی خاطر اپنے آپ کو اس وحشی درندے کو سونپ دیا تو وہ لاپرواہ ہو گئی ایک دم آزاد . . . ."

"غلط کہتے ہو اس میں بے حیائی قطعی نہیں ابھی تک۔ وہ گلاب کے پھول کی طرح تازہ ہے"۔

"ہاہا ہو ہو۔۔۔ گلاب کے پھول کی طرح تازہ خوب کہا۔ گلاب کا پھول۔۔۔ اب تو وہ جنگلی گلاب کا پھول بن گئی ہے"۔ متکلم برابر ہنسے جا رہا تھا۔

"خیر صاحب آپ کی مرضی آپ اس گلاب کے پھول کو اپنے پاس رکھیں یا توڑ کر پھینک دیں۔ توڑ کر پھینکنا ہی پڑے گا"۔

"معاف کیجئے نہ ہی میں اس تالاب کو خشک کراؤں گا۔ نہ ہی یہ ڈھلوان ہموار ہو گی۔ سمجھ گئے۔ میرا ارادہ اس تالاب میں کنول لگانے کا ہے تاکہ وقت کٹ جایا کرے"۔

"مگر"

"مگر صاحب کہیں کنول کے پودوں کے اُگ آنے تک یہ تالاب سڑ نہ جائے اور۔۔۔"۔ متکلم نے ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا سنبھالا اور اس کو ہوا میں ذرا ہولے سے گھمایا تاکہ سنبھالنے کا ٹھیک انداز معلوم ہو جائے۔ "ہاں تو بابو صاحب اب کیا ارادہ ہے۔ یہ تالاب خشک کرائیں گے یا نہیں۔ گاؤں تو اس بات کو منوا کر رہے گا ہی"۔

"نہیں۔ عجب بیوقوف آدمی ہو۔ تالاب صاف نہیں کراتے گاؤں کی کیسی ذلیل لڑکی سے محبت بھری باتیں کرتے ہو۔ کنول کے پھول۔۔۔"۔

اک ڈنڈا ہوا میں بلند ہوا اور نیچے کی طرف گر گیا۔ سریندر کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کا سر گھوم گیا۔ ڈھلوان اور تالاب فضا کے بھنور میں پھنس کر تیزی سے

چکر کاٹ رہے ہیں۔ اور چکر کاٹتے کاٹتے ہمواری میں شامل ہو گئے ہیں۔
اس کے مُنہ سے ایک زبردست چیخ نکلی۔

"کیا بات ہو گئی تھی سرپندر؟"

"کچھ نہیں ڈھلوان پر ٹھوکر لگ گئی اور بہت دُور تک لڑھکتا چلا گیا۔
یہ ڈھلوان بڑی ہے۔" سرپندر نے کراہتے ہوئے کہا "اور سویرے سویرے
نوکر کہتا تھا کہ تالاب کے پانی میں کیڑے پڑنا شروع ہو گئے ہیں۔ بیماری پھیلنے
کا اندیشہ ہے۔"

"ہاں، تو میں بھی سوچتا چلا آرہا تھا کہ ڈھلوان پر ٹھوکر کھائی اور لڑھک
گیا۔ پہلے یہ جگہ کتنی ہموار تھی۔"

دوسرے روز گاؤں کا بچہ بچہ ڈھلوان کو ہموار کرنے اور تالاب کے
پانی کو باہر نکال پھینکنے میں مشغول ہو چلا تھا۔ سرپندر کے سر پر پٹی بندھی
ہوئی تھی اُس نے دیکھا بسنتی اس گروہ میں شامل کام میں مشغول ہے۔ اب
وہ کتنی عام لڑکی بن گئی ہے۔ شاید ڈھلوان کے خیال نے اُسے خوبصورت
بنا دیا تھا۔ اور تالاب کے کیڑے مٹی اور تلچھٹ میں پناہ مانگنے کے لئے اِدھر
اُدھر دوڑتے پھر رہے تھے۔

"ہندوستان ویکلی" (ادبی نمبر) اپریل سنہ ۱۹۴۳ء

جب پیپل کے پیچھے سورج چھپ رہا تھا

ہلکا سا مدرسہ، ننھے ننھے طالب علم اور نوجوان مدرس، ایک نہایت ہی عجیب گروہ۔ محلے کے نکڑ پر ماسٹر جی کا مدرسہ تھا۔ ننھے ننھے طالب علم پڑھنے آتے اور بلند آوازوں سے اپنے سبقوں کو یاد کرنا شروع کر دیتے "اپنے بادشاہ کی عزت کرو"۔ "استاد کا حکم مانو"۔ "دو اور دو چار ہوتے ہیں"۔ "سورج مشرق سے نکلتا ہے"۔ سفید تختیاں اور کالی کالی دواتیں جن میں سفید کھریا گھول کر روشنائی تیار کی گئی ہو۔ کچی لپی پتی زمین پر ماسٹر جی ٹاٹ کا ٹکڑا بچھا دیتے اور ایک بنچ پر اتنی سی ننھی ڈنڈی لیکر پڑھانے کے لئے بیٹھ جاتے۔ کسی طالب علم

سے ذرا غلطی ہوئی اور ماسٹر صاحب نے گرم گرم ضرب لگائی۔ علی الصباح ماسٹر جی پاس والے مندر میں نہانے کے لئے چلے جاتے۔ مندر میں پجاری دیوی دیوتاؤں کو سر نواتے، جے سیتا رام، جے سیتا رام کرتے واپس اپنی کوٹھری میں آن براجتے۔ کھانا خود پکاتے، چوکا صاف کرتے، برتن مانجھتے اور مدرسہ کے آغاز کے وقت تک آرام سے تان کر سو رہتے۔

ماسٹر جی کے مکان کے آنگن میں ایک چھوٹا سا گلاب کا پودا تھا جسکی قلم ماسٹر جی بڑی منت سماجت سے مندر کے پجاری سے مانگ کر لائے تھے۔ اس پودے میں کبھی کبھی ایک ہلکی سی کلی نکلتی مگر پھول کبھی نہ کھلتا۔ ماسٹر جی نے لاکھ جتن کئے مگر گلاب کے پودے میں نہ پھول کھلنا تھا نہ کھلا۔ ماسٹر جی نے اپنے طالب علم موتی رام سے جن کا باپ باغبانی کے فن میں ید طولیٰ رکھتا تھا کئی بار مشورے کئے لیکن اُس گلاب کے پودے میں پھول نہیں کھل پایا۔

ماسٹر جی کا مدرسہ آس پاس کے علاقے میں کافی مشہور تھا۔ اس واسطے اُن کی گذر اوقات اچھی طرح سے ہو جایا کرتی تھی۔ بدقسمتی سے ماسٹر جی دنیا میں بالکل اکیلے تھے۔ نہ ماں، نہ باپ، نہ بھائی، نہ بہن تنہا درخت پر تنہا پھول، ایک مجرد ٹہنی، ایک اکیلی ٹہنی جس سے یہ بھی اُمید نہیں کی جاسکتی کہ وہ آگے اپنی نشانی چھوڑے گی یا نہیں۔ . . .

"ماسٹر جی" موتی رام کہتا۔ "اب کی بار برسات میں اس گلاب کے پودے کو ایک ایسا کھاد دونگا کہ موسم میں بہت سارے پھول کھلیں گے حد سے زیادہ۔"

"اچھا بھئی، دیکھیں تیری ترکیب" ماسٹر جی نہایت تسلّی سے کہتے۔ پھر اپنے دوسرے کاموں میں مشغول ہو جاتے۔ گلاب میں کلی لگتی۔ ماسٹر جی غور سے اُسے دیکھتے۔ ڈوڈا ذرا بڑا ہوتا، اس میں سُرخ سُرخ غلاف سا اندر ہی اندر بننے لگتا اور پھر ماسٹر جی تمنّا لگا بیٹھتے کہ پھول اب کھلا، اب کھلا۔ لیکن نہ معلوم قلم کون سے کمبخت دن زمین میں لگائی گئی تھی کہ کلی پھول میں تبدیل نہ ہو پائی۔

ایک روز ایک صاحب ماسٹر جی سے ملنے آئے۔ گلاب کا پودا دیکھا۔ "کیوں صاحب اس میں کیسے پھول لگتے ہیں؟" نئے صاحب نے غور سے دیکھ کر پوچھا۔

"اجی پھول تو نہیں لگتے، کلی ضرور بندھتی ہے۔ اور جب پھول کھلنے کا زمانہ آتا ہے تو کلی مرجھا کر زمین پر گر پڑتی ہے۔" ماسٹر جی نے روکھا چہرہ بنا کر کہا۔

"پھر کلی بندھنا بیکار ہے جب تک پھول نہ کھلے۔ اس پودے کو اکھاڑ کر پھینک دیجئے دوسرا لگائیے صاحب۔ اگر کلی بندھتی رہی اور پھول نہ کھلا تو کیا فائدہ"۔ ماسٹر جی کے ملاقاتی نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

"کبھی نہ کبھی تو کھلے گا صاحب" ماسٹر صاحب نے اطمینان سے فرمایا۔

"اچھا صاحب دیکھیں گے" اور ملاقاتی چلے گئے۔ اور پھر۔۔۔

ماسٹر جی بیمار پڑ گئے۔ کھاٹ پر لیٹے رہے۔ طالب علم اپنی اپنی جگہ بیٹھ کر پڑھتے رہے۔ ماسٹر جی کا پلنگ آنگن میں پڑا رہتا۔ سامنے کے منڈ

کے چبوترے پر چڑیاں باجرے کے دانے چُن چُن کر کھاتی تھیں ۔ مندر کے صحن میں کھڑے بڑے پیپل کے درخت سے نیچے گرے ہوئے پتّے اس چبوترے پر اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر سرکتے رہتے ۔ چبوترے کے ایک کونے میں پانی کی گول رکھی رہتی اور پجاری کا لڑکا راہگیروں کو پانی پلاتا رہتا ۔ ماسٹر جی کے طالب علم بھی مندر کے چبوترے والی پیاؤ سے پانی پی کر آیا کرتے تھے ۔ مندر کے پاس ایک ریتیلا سا میدان تھا گرمیوں کے دنوں میں رات کے وقت قدرے سرد ریت میں گدھے اور خچر وہاں آن کر لیٹ جاتے تھے ۔ اور اپنی بے ہنگم آوازوں سے ماسٹر جی اور مندر کے پجاری کے سکون میں خلل ڈالتے تھے . . . .

ایک روز ماسٹر جی کھاٹ پر آرام فرما رہے تھے ۔ لڑکے اپنے اپنے سبقوں کو نہایت بھونڈے انداز سے پڑھ رہے تھے ۔ ایک لڑکے نے نہایت آرام کے ساتھ پڑھنا شروع کیا ۔ شاید وہ عبارت ایک سرے سے کتاب میں غائب تھی ۔

" گلاب کے پودے میں کلی بند نکلی ۔ ایک ۔ دو ۔ تین ۔ کتنی ہی کلیاں ، لیکن پھول نے کھِلنے کا نام ہی نہ لیا ۔ پھول کھِلے بھی تو کیسے ۔ پودے میں ٹھیک کھاد بھی تو نہیں پڑتی تھی ... اس واسطے گلاب کے پودے میں پھول ہی نہ کھلا "

" اِدھر آؤ " ماسٹر جی نے لڑکے کو اپنے پاس بلایا ۔

" اِدھر لکھا ہے دکھاؤ "

"اس میں تو نہیں ہے" لڑکا سٹ پٹایا۔ کتاب اوندھی پڑی تھی۔

ماسٹر جی کو غصہ آیا کہ اس لڑکے کو وہیں مسل کر رکھ دیں لیکن کسی جذبہ کے تحت وہ وہیں رُک گئے مگر آخر غصہ تو تھا ہی تھوڑا یا زیادہ۔ کچھ نہیں تو اس لڑکے کے کان اینٹھ دیئے۔ لڑکا کان ملتا ملتا اپنی سیٹ پر پہونچا۔ شام ہو چلی تھی مندر میں کنویں کی مینڈھ پر عورتیں اور لڑکیاں پانی بھر رہی تھیں۔ پیپل کے پیچھے سورج چھپ رہا تھا۔ مندر کے چبوترے پر چڑیاں باجرے کے دانے چننے میں مشغول تھیں۔ اور پجاری کا لڑکا راہگیروں کو پانی پلا رہا تھا۔ خچر اور گدھے سرِ شام سے ہی مندر کے پاس والے میدان میں لوٹ لگا رہے تھے۔ سزا یافتہ لڑکے کے کان کی لَو تڑپ رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھا مندر کے چبوترے تک پہونچا اور برابر کان مسلے جا رہا تھا۔

"کیا ہوا تجھے" ایک لڑکی نے گھاگر سنبھالتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں۔ ماسٹر جی کے گلاب کے پودے میں پھول نہیں کھلتا۔ میں بیٹھا بیٹھا یہی الاپ رہا تھا کہ کلی بندھتی مگر پھول نہیں کھلتا۔ بس ماسٹر جی نے ایا اور میرا کان مروڑ ڈالا...... تب ہی"۔

کنویں کی مینڈ پر ایک دم کتنے ہی سُرخ گلاب کے پھول کھل گئے سُرخ ہلکے پیازی، سفید، کچھ قدرے سیاہی مائل، ایک دم کتنے سارے پھول۔ مندر کے چبوترے پر چڑیاں برابر باجرے کے دانے چننے میں مشغول تھیں۔ ماسٹر جی آنگن میں لیٹے ہوئے تھے۔ گلاب کے پودے میں ایک ہلکی سی کلی چٹک سی رہی تھی۔ شام سر پر آن پہونچی تھی اور ماسٹر جی کے طالب علم اپنے اپنے بستے

سنبھالنے میں مشغول ہو چلے۔ ماسٹر جی گلاب کے پودے کی طرف دیکھ لیتے اور کبھی کبھی پنگھٹ پر ایک نظر ڈال لیتے تھے۔ شاید ماسٹر جی کا دل اتنا حساس نہیں تھا کہ وہ پنگھٹ پر آنے والی گلاب کی کلیوں کو چٹکتا دیکھ سکیں۔ سورج پیپل کے پیچھے چھپ رہا تھا۔ گدھے اور خچر ریتیلے میدان میں لوٹ لگا رہے تھے۔ ماسٹر جی گلاب کے پودے کی طرف دیکھتے دیکھتے سو رہے۔ . . .

طالب علموں نے اُس روز سے قسم کھالی کہ وہ کبھی ماسٹر جی کے گلاب کے پودے کے بارے میں تذکرہ نہ کرینگے۔ لیکن جب شام اپنا ڈیرہ اس مندر کے پنگھٹ اور ریتیلے میدان میں جمانا شروع کرتی تو پنگھٹ پر پانی بھرنے والیاں اور عورتیں طالب علموں سے پوچھتیں "ماسٹر جی کے گلاب کے پودے میں پھول لگا یا نہیں ؟"

گلاب کے پھول کی نت لڑکیوں کو کس لئے۔ جب ماسٹر جی کا دل ہی اتنا حساس نہیں تھا کہ وہ گلاب کے پھول کی تمنّا۔ اس مندر کے پنگھٹ پر سینکڑوں گلاب کے پھول کھلکھلا کر ہنس دئے۔ مسرت آمیز خوشی میں ڈوبے۔ پھر قدرت نے انہیں اُن کی تروتازگی سے محروم کردیا۔ اور وہ مُرجھا گئے۔ اُن کی جگہ نئے پھول لے لیتے۔ اُس مندر کے پنگھٹ پر نت نیا پھول کھلتا۔ وہ نیا پھول اپنے ساتھ نیا رنگ، نیا ڈھنگ، نیا انداز لاتا۔ مگر شاید ماسٹر جی کے دل میں ان پھولوں کے لئے کوئی جگہ نہ تھی . . . . لیکن لڑکیوں کا اشتیاق روز بروز بڑھتا گیا۔ وہ شام کے وقت مندر کے پنگھٹ پر آتیں اور اُن کو کریدنی سی لگتی اس بات کو پوچھنے کی، آیا ماسٹر جی کے گلاب کے پودے میں پھول کھلا یا نہیں۔ چڑیاں

مندر کے چبوترے پر بکھرے باجرے کو چنتی رہتیں۔ سورج پیپل کے درخت کے پیچھے چھپ جاتا۔ ریتیلے میدان میں گدھے اور خچر لوٹ لگانا شروع کردیتے اور ماسٹر جی کے گلاب کے پودے میں کلی لگتی مگر پھول نہیں کھلتا۔ ماسٹر جی نے لاکھ جتن کئے اُن کو آہستہ آہستہ یہ معلوم ہو چلا تھا کہ پنگھٹ پر پانی بھرنے والیاں بھی اکثر ان کے طالب علموں سے دریافت کیا کرتی ہیں کہ "گلاب کے پودے میں پھول کھلا یا نہیں"۔ اس وقت ماسٹر جی کے چہرے پر سرخی سی دوڑ جاتی اور وہ گردن نیچے ڈالکر کچھ سوچنا شروع کردیتے "آپ کے اس گلاب کے پودے میں پھول نہیں کھلا تو اس کو ایک سرے سے اکھاڑ کر پھینک دو۔ لیکن موتی رام کہتا تھا آپ کی دفعہ وہ اس پودے میں ایسا کھاد دیگا کہ پھول ضرور کھلیں گے اچھا اب ایک بار اور امتحان سہی"۔

پنگھٹ پر کھلنے والے پھول سے ماسٹر جی کو ذرا تھوڑی تھوڑی ہچکچاہٹ سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اسی وجہ سے اُنہوں نے کئی بار اپنے طالب علموں کو منع کیا کہ وہ پڑھنے کے دوران میں کبھی پیاؤ پر نہ جائیں۔ اگر جائیں بھی تو صرف پانی پینے کے لئے۔ فضول وقت ضائع کرنے کے لئے نہیں۔ اگر ان کو زیادہ ہی پیاس لگتی ہے تو وہ اُن کے لئے ایک بڑا گھڑا خرید دیں گے جب اپنی جگہ سے اُٹھے اور جھٹ پانی پی لیا۔

شام ہوتی، پنگھٹ پر پیاسی آنکھیں ننھے طالب علموں کی طرف دیکھتیں لیکن ماسٹر جی کے ڈر کے مارے طالب علم اُن کے پاس تک نہ پھٹکتے، ماسٹر جی دل ہی دل میں سوچتے آخر اُن لڑکیوں کو گلاب کے پودے کا کیوں خیال ہے۔ بیکار۔

اُن کو ان باتوں سے کیا مطلب۔ آخر وہ اس بارے میں پوچھتی کیوں ہیں۔ اگر پھول نہ کھلا تو نہ سہی، ہرج ہی کیا ہے۔ لیکن ماسٹر جی کو رہ رہ کر تعجب ہوتا تھا کہ آخر گلاب کے پھولوں کی تمنّا کیوں اُن پر غالب آئے جا رہی ہے۔ اُس تمنّا نے اُن کے دل و دماغ پر تسلّط کر لیا ہے۔ اور اُنہوں نے تین چار دفعہ موتی رام سے بھی پوچھا تھا۔ "بھئی وہ کھاد کب ڈالو گے؟"

"ماسٹر صاحب ذرا موسم آنے دیجئے۔ میرے چچا نے وہ کھاد استعمال کیا تھا تو کھیتی بہت زور کے ساتھ ہوئی" موتی رام نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

ماسٹر جی غور سے گلاب کے پودے کی طرف دیکھتے رہتے، ہری ہری کلی، بڑھتا ہوا ڈوڈا، سُرخ سُرخ ہلکے پیازی رنگ کا خول سا، نہایت ریشمی سطح، ہلکے ہلکے نازک پتے جو اُس خول کو سنبھالے ہوئے ہوں۔ ایک پھول، نہایت ہی شاندار گلاب کا پھول، بکھری ہوئی پتیاں اور ... تمنّا کے پھول۔ گلاب کے پھول کی تمنّا بیدار ہو چلی۔ اُف کتنے پھول ... اتنے سارے مگر وہ جذبہ آہستہ آہستہ فرو ہوتا گیا۔ وہی گلاب کا فضول سا پودا، تنہا سی کلی، وہ بھی مُرجھائی سی، کچھ مری ہی، اور موتی رام ... گلاب کے پھول کی تمنّا ... ایک ناقابلِ تکمیل تمنّا۔ لیکن جو برابر شعور کے تاروں میں جھنجھناہٹ پیدا کرتی رہتی۔ شاید روزِ ازل کا تاثر، جب خدا رُوح پھونکتا ہے تو پھولوں کی تمنّا بیدار ہوتی ہے۔ ماسٹر جی کو گلاب کے پھول کی تمنّا تھی۔ وہ ایک دوسری تمنّا کا غیر مرئی سایہ تھا، ایک ایسی تمنّا جو ماسٹر جی کے مستقبل میں جھانک رہی تھی اور حال میں صرف گلاب کے پھول میں جذب ہو چلی تھی۔ لیکن گلاب کا پھول کھلنے کا نام ہی نہ لیتا۔ انتظار ایک بے معنی انتظار۔

لڑکے موتی رام سے پوچھتے: "کیوں بھئی ماسٹر جی کے لئے کھاد نہیں لایا؟"

موتی رام کے دہن سے لعاب سا ٹپک پڑتا، پیشانی سکڑ جاتی اور وہ راستے میں ہنسنا شروع کر دیتا۔ طالب علم بھی اس خوشی اور تبسّم میں شریک ہو جاتے اور شام کو جب سورج پیپل کے پتّوں کے پیچھے غروب ہوتا تو پنگھٹ پر پانی بھرنے والیاں پیاسی نگاہوں سے طالب علموں کی طرف دیکھتی رہتیں۔ اُنہیں ایک بیتابی سی ہوتی۔ ماسٹر جی نے گلاب کے پودے کے بارے میں سُننے کی۔ اور ایک روز جب چڑیاں مندر کے چبوترے پر باجرے کے دانے چُننے میں مصروف تھیں اور سُورج پیپل کے پیچھے چھُپ رہا تھا، پنگھٹ پر پانی بھرنے والیاں ماسٹر جی کے کھُلے ہوا دار مدرسے کے عین نزدیک سے گذریں۔

"موتی رام" ایک لڑکی بولی اور مُسکرا دی۔

"موتی رام گلاب کے پودے میں پھُول کھلا؟" دوسری نے ذرا زور کیسا تھ کہا۔

"ماسٹر جی نمستے۔ آپ کے گلاب کے پودے میں پھُول کھِلا؟" اور جھرمٹ کا جھرمٹ کھلکھلا کر ہنس دیا۔

ماسٹر جی شرم کے مارے پانی پانی ہوئے جارہے تھے۔ اُن کی گردن اور پیشانی پر ننھے ننھے پسینے کے قطرے جمع ہو گئے۔ آخر اُن لڑکیوں کو ان کے گلاب کے پودے سے کیا سروکار۔ . . بھولے سے مُنہ سے کہتی ہیں "موتی رام . . . . ماسٹر جی نمستے"۔ اُونہہ! اگر گلاب کے پودے میں پھُول کھِلا تو کھلا، اگر نہیں کھِلا تو نہ سہی۔ جائے گلاب کا پودا اور اُس میں آنیوالے پھُول جہنّم میں۔

سورج پیپل کے درخت کے پیچھے چھپ رہا تھا۔ ماسٹر جی کی نگاہیں گلاب کے پودے کی طرف دیکھتے دیکھتے تھک سی گئیں۔ وہ چپ چاپ کھڑے ہوئے اور میدان کی طرف چل دئے۔ اِدھر اُدھر کچے کچے کھنڈر سے کھڑے تھے اور مٹی کے ٹیلے..... ماسٹر جی نے دیکھا کہ اُن مٹی کے ٹیلوں میں خود رو درخت ہیں اور اُن میں مختلف رنگ کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ کتنے مست پھول.... لیکن ماسٹر جی گلاب کے پودے میں اتنی محنت کے باوجود بھی کیوں پھول نہ کھلا سکا۔ تھوڑا تھوڑا غصہ اور شکست کا احساس۔ ماسٹر جی کے فلسفی دل نے کہا شاید وہ قدرت کے کاموں میں دخل نہیں دے سکتے۔ قدرت جسکو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتی ہے وہ ہی نشوونما پاتے ہیں اور انسان جس پودے کو ترقی دینا چاہتا ہے وہ لاکھ جتن کرنے پر بھی نشوونما نہیں پاتا۔ ازل کا قانون۔ انسان قدرت کے سامنے بے بس ہے۔ مگر؟.... ماسٹر جی نے پھر سوچا۔ آخر وہ لڑکیاں گلاب کے پھول کے بارے میں کیوں پوچھتی ہیں۔ انہیں کیا مطلب، ابکی دفعہ موتی رام کے کھاد کی مدد سے ضرور پھول کھلیں گے۔ اور جب پنگھٹ پر آنیوالیاں گلاب کے پھول کے بارے میں دریافت کرینگی تو وہ خوشی خوشی اُنکو اپنے آنگن میں لیجائیگا اور کہیگا یہ دیکھو گلاب کا پھول۔ گداز گداز باہیں، رنگ برنگی ساڑیاں، بغل میں گاگر، ہر قدم پر موسیقی کے نئے راگ جگاتی ہوئی وہ اُسکے آنگن میں روشنی پھیلا دینگی۔ وہ اُن سے کہیگا "لو دیکھو گلاب کے پھول، کتنے سُرخ اُنکے نازک ملائم رخساروں سے زیادہ سُرخ"۔ ماسٹر جی نمستے، کتنی شوخ اور طرار ..... سُونا گھر، اکیلا دل اور گلاب کا پھول..... ایک سوتے ہوئے دلمیں جاگتا ہوا احساس گلاب کے پھول کی تمنا، کلی ہری ہری کلی، ایک ہلکے سُرخ رنگ کا اندرونی خول اور

ایک اُمید، کھلنے والی اُمید... "ماسٹر جی نمستے "نمستے... اور وہ جوں جوں اس گلاب کے پودے میں پھول کھلیں گے ووں ووں اور خوش ہو گا۔ ایک پھولوں کی مالا.... ماسٹر جی نمستے ..... نمستے! نمستے!!

"ماسٹر جی! ماسٹر جی!! پجاری کا لڑکا چلّا اٹھا "ماسٹر جی آپکا گلاب کا پودا بکری چبا گئی"۔

"ایں!" ماسٹر جی ہڑبڑا کر اُٹھے "ایں!

آنگن میں گلاب کا پودا زمین سے صرف دو انگل اونچا رہ گیا تھا۔ بکریوں نے اُس کا ستیاناس کر دیا تھا۔ ماسٹر جی کھڑے سوچ رہے تھے کہ کیا کریں۔ اُن کو ایک عظیم رنج کا احساس ہو رہا تھا۔ گلاب کے پھول کی تمنّا سرد پڑ چلی۔ وہ تمنّا جو اب اصلی روپ میں جاگی تھی۔

دوسرے روز وہ لڑکیاں پھر ماسٹر جی کے مدرسے کے پاس سے گذریں۔ ایک لڑکی آگے بڑھی۔ "نمستے!"

ماسٹر جی کی نگاہ آنگن میں گھوم گئی۔ گلاب کا پودا صرف ایک بے خالی بھدی سی ٹونڈی رہ گیا تھا۔ "بکری کھا گئی"! ماسٹر جی نے نہایت افسردگی سے فرمایا۔

لڑکیاں ہنستی ہنساتی پنگھٹ پر پانی بھرنے چلی گئیں۔ مندر کے چبوترے پر چڑیاں باجرے کے دانے چننے میں مشغول تھیں۔ ماسٹر جی سوچ رہے تھے کہ شاید اب اُنکی تمنّا کا پھول گلاب کا پھول ضرور کھلے گا۔ آنگن میں پازیب کی جھنکار جنت کے نغمے اور وہ ایک مالا تیار کئے جائیں گے۔ اُس پازیب کی جھنکار کی حامل خوبرو نی کو پہنانے کے لئے.... "ماسٹر جی نمستے"۔ پنگھٹ پر لڑکیاں پانی بھر رہی تھیں اور سورج پیپل کے پتّوں کے نیچے چھپا رہا تھا۔

ستمبر ۴۲ء

"ساقی"